آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2021

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

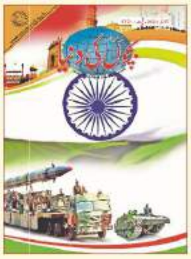

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 6 جون 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	ڈاکٹر لکشمی سہگل	ڈاکٹر نسرین بیگم	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں	عدلیہ میں خواتین کی حصہ داری	خواجہ عبدالمنتقم	10
	شکیلہ بانو بھوپالی ایک شاعرہ	شمس الہدیٰ انصاری	13
	ناول ''آتش دان'' دیہی زندگی کا آئینہ دار	عبدالمغنی صدیقی	16
	نصرت مہدی کی شعری کائنات	ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی	20
	بلقیس ظفیر الحسن کا شاعرانہ تخیل	ڈاکٹر شعیب انصاری	24
	غضنفر علی کی ناول نگاری	ڈاکٹر کہکشاں عرفان	28
	اکیسویں صدی کے اردو سفرناموں میں خواتین کا حصہ	محمد ارشد کسانہ	33
	اساتذہ کی پیشہ وارانہ ترقی: چند رسمی مواقع	راحلہ خاتون	37
	عصمت چغتائی کے فکر وفن پر ایک نظر	نازیہ پروین سید	40
کہانیاں	اندھیروں سے اجالے تک	ناہید طاہر	44
	وہ آئے گا	شہناز رحمٰن	47
حسن سخن	ڈاکٹر شبنم عشائی، ڈاکٹر جوہی بیگم شاما		53
باورچی خانہ			55
صحت	صحت	مشکور احمد	57
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		62

مشعل

زمانہ کیسا بھی رہا ہو ہر دور میں ادیبوں اور شاعروں نے ہمارے علم میں اضافہ کیا ہے۔ موجودہ وقت میں بھی ہم کورونا کی وبا سے دوچار ہیں۔ وبا کا یہ دور کسی المیہ سے کم نہیں ہے، ایسے میں ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے ادیب اور شاعر اب کس طرح کا ادب تخلیق کریں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس عالمی وبا نے بہت سے نئے مسائل کو جنم دیا ہے۔ آج کے ادیب بڑے ادب کی تخلیق کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس کورونا کے دور میں اب تک کئی ادبی شہہ پارے منظر عام پر آچکے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

جب کوئی بحران وقوع پذیر ہوتا ہے تو حساس ادیب اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے یہ صرف ایک المیہ ہوسکتا ہے لیکن ادیبوں اور فنکاروں کے ذہن پر یہ ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس تاثر اور کیفیت کو وہ اپنی تحریروں میں شامل کرتے ہیں اور اہم شہہ پارے وجود میں آتے ہیں۔

کسی بڑی وبا سے ہم سب کا پہلی دفعہ سامنا نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے پہلے بھی کئی وبائیں آئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دو عالمی جنگوں کا بھی ہم نے سامنا کیا ہے۔ کورونا نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ ادب میں بھی اس وبا سے متعلق بہت سا لٹریچر تخلیق ہوا ہے۔ موجودہ وقت میں سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے لوگوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ادب کو ذریعہ بنایا ہے۔ لاک ڈاؤن کے دور میں بہت سے ادبی پروگرام آن لائن سمینار، مشاعرے، افسانہ خوانی جیسے پروگرام منعقد کیے گئے اور ان سے قاری نے استفادہ بھی کیا۔ بہت سی نادر کتابوں تک رسائی حاصل کی اور کتب بینی کے تئیں دلچسپی کا اظہار کیا۔

وبا کے دوران بہت سی تبدیلیوں کا ہمیں سامنا ہے۔ کورونا کے بحران نے صرف فنکاروں کو ہی نہیں بلکہ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حساسیت میں اضافہ کیا ہے۔ دنیا کے ادیبوں اور فنکاروں کی تخلیقات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ لاک ڈاؤن کے وقت میں تخلیق کاروں نے اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا ہے اور کچھ نادر تخلیقات ادب کو دی ہیں۔

عالمی وبا نے انسانی جذبات و احساسات میں ایک لرزش سی پیدا کردی ہے جو ہمارے وجدان کو جھنجھوڑتی ہے اور ہمارے شعور کو بیدار کرتی ہے۔ ہمارے سوچنے کا زاویہ بھی تبدیل ہوا ہے اور ایک نئی دنیا سے ہم روبہ رو ہوئے ہیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر انٹرنیٹ اور سوشل نیٹ ورکنگ کے ذریعہ مختلف پلیٹ فارم پر ادیب و شاعر اپنی دلچسپی کا اظہار مختلف زاویوں سے کر رہے ہیں۔ کورونا کے بعد تخلیقی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوں گی جس کی وجہ سے ادب میں نئے رجحانات پیدا ہوں گے۔ افسانہ، شاعری، ناول کی صنف میں مزید وسعت پیدا ہوگی۔ فکشن کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ صرف اضافہ ہی نہیں ہوگا بلکہ بہت سی نئی اصناف بھی وجود میں آئیں گی اس کی ہم توقع کرتے ہیں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

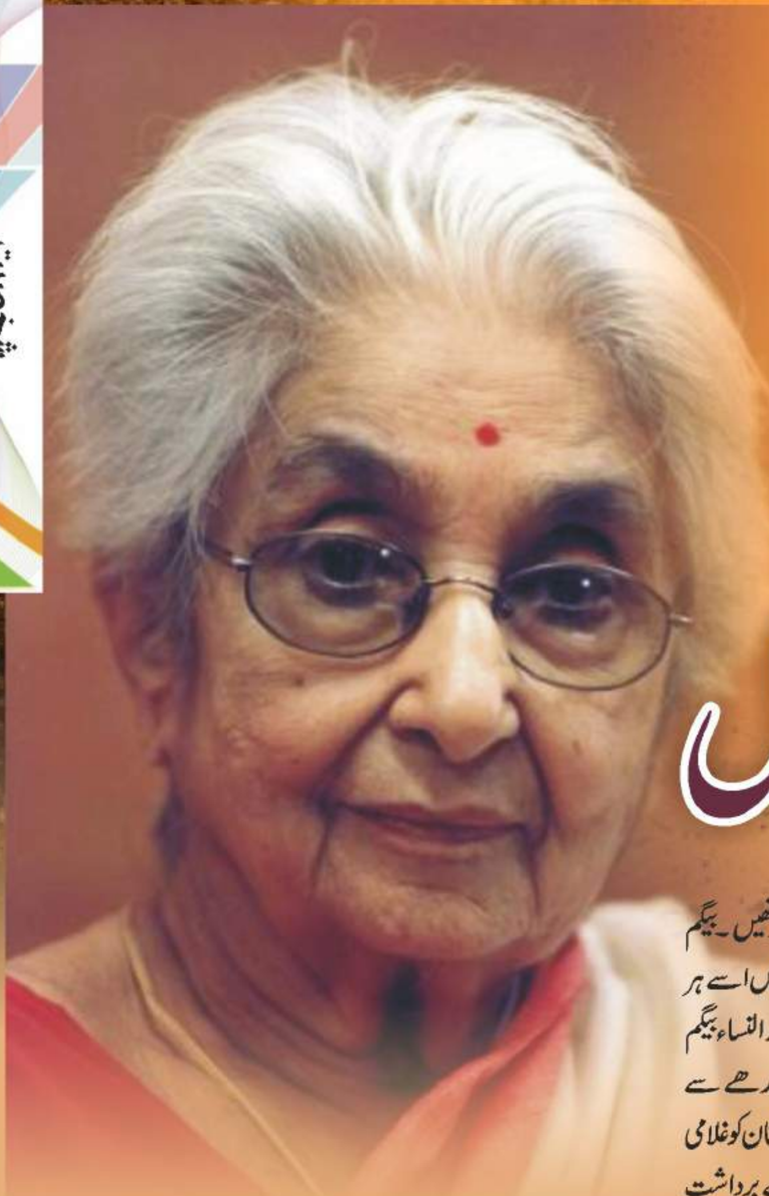

ڈاکٹر نسرین بیگم

ڈاکٹر لکشمی سہگل

رضیہ سلطانہ ہندوستانی تاریخ کی اولین خاتون تاجدار تھیں۔ بیگم حضرت محل ہندوستان کی آزادی کے جس مقصد کو لے کر چلیں تھیں اسے ہر لمحہ پیش نظر رکھا۔ مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی کی بیوی نشاط النساء بیگم ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں حسرت موہانی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بیوی زلیخا بیگم ہندوستان کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے آزاد کے بار بار جیل جانے کو خوشی سے برداشت کرتی رہیں تاکہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ چاند بی بی کی بہادری، جھانسی کی رانی مہارانی لکشمی بائی جنھوں نے جنگ آزادی ہند 1857 میں انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ عزیزن بائی ایک بہادر خاتون تھیں۔ جنھوں نے وطن کی خاطر اپنی جان قربان کردی۔ جھلکاری بائی، اونتی بائی، اودا بائی، بی اماں والدہ علی برادران، امجدی بیگم زوجہ محمد علی جوہر، بھیما بائی ہولکر، بیگم زینت محل جیسی خواتین کا نام تاریخ میں روشن باب ہے۔ ان خواتین کے حوصلے سے آنے والی نسلوں خاص طور پر خواتین میں بیداری اور حوصلہ پیدا ہوگا اور ہمارا ملک ترقی کر سکے گا۔

خواتین ہمارے معاشرے کا وہ حصہ ہیں جس کے بغیر کسی بھی قوم یا ملک کی ترقی ناممکن ہے۔ ان بہادر خواتین کی فہرست طویل ہے ہماری نگاہ جہاں تک جاتی ہے وہیں ٹھہر جاتی ہے اور ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم 28 جولائی 1914 سے 11 نومبر 1918 تک جاری رہی۔ 1914 کا ہی سال تھا جہاں بیحد اتار چڑھاؤ اور ہر طرف اتھل پتھل کا ماحول تھا۔ ایسے حالات میں 24 اکتوبر 1914 کو ایک ایسی بچی کی ولادت ہوئی جس کا نام لکشمی رکھا گیا۔ لکشمی کے والد کا نام ایس سوامی ناتھن تھا۔ وہ مدراس عدالت عالیہ کے مشہور وکیل تھے۔ نانی اے وی امو کٹی ایک مضبوط ارادے والی خاتون تھیں۔ وہ ایک سماجی خاتون تھیں۔ والدہ امو سوامی ناتھن تھیں۔

لکشمی کو بچپن سے ہی گھڑ سواری، تیراکی اور ٹینس کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ بچپن سے ہی دوسروں کی مدد کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتی تھیں۔ ان پر سروجنی نائڈو اور سروجنی کی بہن سوہاسنی نامبیار کا کافی اثر تھا۔

1940 میں مدراس میڈیکل کالج سے لکشمی نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ 1940 میں ہی دوسری جنگ عظیم کی ابتدا ہو چکی تھی۔

لکشمی کا مقصد ہندوستان کو غلامی سے آزاد کرانا اور ہندوستان میں غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی دیکھ بھال تھا۔ بچپن سے ہی غریبوں کی خدمت کرنا انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اسی مقصد کے تحت جب ڈاکٹروں کو برٹش بھارتیہ فوج میں بھرتی کرنے کی بات ہوئی تو اس وجہ سے سنگاپور چلی گئیں اور وہاں نجی میڈیکل پریکٹس شروع کردی۔

8 دسمبر 1941 کو جاپانی فوج نے سنگاپور پر حملہ کردیا۔ اس وقت بزرگ مجاہد آزادی راس بہاری بوس جاپانیوں کے ساتھ پہنچے تھے۔ انھوں نے انڈیا انڈیپنڈنٹ لیگ کی شروعات کی۔ لکشمی کہتی ہیں کہ:

"سبھی بھارتیوں سے امید کی جاتی تھی کہ وہ لیگ میں شامل ہوں۔ اس میں فائدہ بھی تھا کیوں کہ ہمیں راشن کارڈ مل گئے۔ ہمارے ساتھ برا برتاؤ نہیں تھا۔ میں بھی لیگ میں شامل ہوگئی۔ لیکن رفاہ عام کا کام محدود ہوگیا"

(کیپٹن لکشمی سہگل کی زبانی 'آزاد ہند فوج کے ساتھ'، سامیا، جولائی سے دسمبر 2012، ص:10)

15 فروری 1942 کو موہن سنگھ نے آزاد ہند فوج (آئی این اے) کی بنیاد رکھی۔ کئی وجوہات کے سبب موہن سنگھ نے آئی این اے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ لوگ ان کے اس فیصلے سے خوش نہں تھے۔ اسی بیچ سبھاش چندر بوس جولائی 1943 میں جاپان سے ہوتے ہوئے سنگاپور پہنچے۔ ان کے سنگاپور پہنچنے پر راس بہاری بوس نے انڈیا انڈیپنڈنٹ لیگ کی ذمہ داری سبھاش چندر بوس کو سونپ دی۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس نے نئے طریقے سے کام شروع کرتے ہوئے نوجوانوں کو آزاد ہند فوج میں شامل ہونے کے لیے کہا۔ ان کی اس بات کا اثر ایسا ہوا کہ صرف چھ مہینے میں ہی آئی این اے میں تیس ہزار سے بڑھ کر ساٹھ ہزار لوگ شامل ہوگئے۔ ان سپاہیوں میں سنگاپور، برما، ملیشیا، انڈونیشیا، ہانگ کانگ اور تھائی لینڈ سبھی ملکوں سے سپاہی بھرتی ہوئے۔

لکشمی کہتی ہیں کہ سبھاش چندر بوس عورتوں کی ایک پیدل فوج بنانے کے خواہش مند تھے۔ اس فوج کا نام انھوں نے جھانسی کی رانی کے نام پر رکھا۔ یہ وہی جھانسی کی رانی ہیں جنھوں نے 1857 میں برٹش حکومت کے خلاف بہت بہادری سے جنگ لڑی اور ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں زبردست کردار ادا کیا۔

رانی جھانسی رجیمنٹ کی کیپٹن بہادر اور ہمدردی رکھنے والی لکشمی کو بنایا گیا۔ لکشمی سبھاش چندر بوس کی باتوں سے واقف تھیں۔ نیتا جی نے لکشمی کو رہنے کے لیے ایک کمرہ وہیں دے دیا اور لکشمی نے رانی جھانسی رجیمنٹ میں عورتوں کی بھرتی شروع کردی۔ یہ بہت بڑا اور اہم کام تھا جو لکشمی نے کر دکھایا۔ کیپٹن لکشمی سہگل رانی جھانسی رجیمنٹ کے بارے میں لکھتی ہیں:

"وہ 8 جولائی 1943 کا دن تھا۔ ویسے میں نے نیتا جی کو بتادیا تھا کہ مجھے زیادہ عورتوں کے بھرتی ہونے کی امید نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر پڑھے لکھے متوسط طبقے کے لوگ پہلے ہی بھارت لوٹ چکے تھے۔ اب تو خاص طور سے ربڑ کے

باغوں کے مزدوروں کے خاندان رہ گئے تھے اور مشہور متوسط طبقے کا چھوٹا سا حصہ ہی بچا تھا بہر حال نیتا جی نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی انقلابی آندولن میں متوسط طبقے پر منحصر نہیں رہنا چاہئے۔مزدور اور کسان ہی کسی بھی انقلابی آندولن کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ان کی یہ بات پوری طرح صحیح نکلی اور ہمارے لیے بغیر کسی خاص مشکل کے ایک خاتون رجیمنٹ بنانا ممکن ہو گیا جس میں 1500 سو عورتوں کو سپاہی کی ٹریننگ دی گئی اور 200 عورتوں کو نرسنگ اسٹاف کی ٹریننگ دی گئی''

(کیپٹن لکشمی سہگل کی زبانی 'آزاد ہند فوج کے ساتھ' ساميا جولائی سے دسمبر 2012 ص:11)

23 اکتوبر 1943 کو سنگاپور و رنگون میں ٹریننگ شروع ہو گئی اور لکشمی کلینک کو چھوڑ کر ان کی دیکھ بھال میں لگ گئیں اور زخمی فوجیوں کی تیمارداری کرنے لگیں۔بقول لکشمی سہگل ٹریننگ بہت سخت تھی۔خاکی پینٹ اور شرٹ پہننا اور بال کٹوانا ضروری تھا۔

اس طرح تین مہینے کی ٹریننگ کے بعد رانی جھانسی رجیمنٹ کا دستہ سنگاپور سے برما پہنچا۔مئی 1944 میں رجیمنٹ کے چھوٹے چھوٹے دستے رنگون سے امپھال کے راستے پر بڑھتے گئے۔بہت ساری مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے مجبوراً نیتا جی کو فوج کے لوٹنے کا حکم دینا پڑا۔

ڈاکٹر لکشمی نے ان سے کہا کہ:

''میں آزاد ہند فوج کے اسپتال میں کام کرنا چاہونگی،جو اس فوج کے شدید زخمی ہاتھ پیر گنوا چکے فوجیوں کے لیے کھولا گیا تھا۔۔۔برما سے نکلنے سے پہلے نیتا جی اس اسپتال میں آئے تھے اور اسکے اگلے ہی دن اسپتال پر بمباری ہوئی۔اور اسپتال پوری طرح برباد ہو گیا۔وہاں بھرتی زیادہ تر مریض مارے گئے۔جو کچھ گھائل بچے تھے انہیں ہم نے بیل گاڑیوں میں لاد کر وہاں سے نکالا۔لیکن آخر کار رنگون کی سڑک پر بڑھ رہی برٹش فوجوں نے ہمیں پکڑ لیا۔یہ جون 1945 کے شروعات کی بات ہے۔مجھے آزاد ہند فوج کے دوسرے فوجیوں سے الگ کر پوچھ تاچھ کے لیے رنگون لے جایا گیا ۔اور گھر پر نظر بند کر کے رکھا گیا۔مارچ 1946 میں مجھے رہا کیا گیا تھا اور بھارت لایا گیا۔۔آزاد ہند فوج کے مقدمے نے پورے ملک کےy عوام کا دھیان کھینچا تھا۔اور آزاد ہند فوج کے بندیوں کے بچاؤ کے لیے نہرو نے ایک بار پھر وکیلوں کا چوغا پہنا تھا۔بہر حال،ان بندیوں کو بچانے میں سب سے بڑا تعاون بھولا بھائی دیسائی کا رہا۔آزاد ہند فوج کے مقدمے میں ان کی تقریر ایک تاریخی تقریر تھی''

(کیپٹن لکشمی سہگل کی زبانی سہ ماہی ساميا ص: 11)

لکشمی جب میڈیکل کالج کے آخری سال میں تھیں تو پی کے این راؤ جو ایک پائلٹ تھے ان سے شادی ہوئی۔1938 سے 1940 تک دو سال یہ شادی چلی۔اس رشتے سے الگ ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ پی کے این راؤ ایسے شوہر ثابت ہوئے جو بیوی پر اپنا پورا اختیار چاہتے تھے اور دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ لکشمی کے کسی بھی خیال سے وہ اتفاق نہیں کرتے تھے اس وجہ سے یہ ساتھ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا کیونکہ لکشمی جانتی تھیں کہ کنارے کنارے چلنے سے ہم منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔مشکلات کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔

بھنور سے لڑو، تند لہروں سے الجھو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

لکشمی کی دوسری شادی مارچ 1927 کو کرنل پریم کمار سہگل سے ہوئی اور اس طرح وہ اب لکشمی سہگل ہو گئیں کرنل سہگل کے ساتھ نے ان کے اندر اور طاقت پیدا کر دی اور وہ اپنے مقصد میں آگے بڑھتی گئیں۔

آئی این اے Indian National Army کے نوجوان برما علاقے میں 1944 میں مئی اور جون تک رہے۔اس وقت بے شمار لوگوں کی جانیں گئیں۔اس وجہ سے وہاں ایک عارضی اسپتال بنایا گیا۔اور اس اسپتال میں رانی جھانسی رجیمنٹ کی عورتوں نے اپنی خدمات انجام دی۔ 1945 میں برما کے جنگلوں میں لکشمی کو انگریزی فوج نے گرفتار کر لیا اور ایک مہینے کے لیے رنگون میں گھر میں نظر بند کر دی گئیں۔وہاں وہ ایک سکھ آئی این اے کے خاندان کے میڈیکل کی دکان پر مریضوں کو دیکھتی تھیں۔

یہ بات یہاں کہہ دینا مناسب سمجھتی ہوں کہ عورت ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مردوں سے کندھے سے کندھا ملا کر چلی اور مجاز نے اپنی نظم نوجوان خاتون سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

سنائیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

یہ کام اس وقت ڈاکٹر لکشمی سہگل انجام دے رہی تھیں۔زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کرنا ان کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔کرنل پریم کمار 1946 کے آئی این اے کے مقدمے کے تین ملزموں میں سے ایک تھے۔ لاہور سے لکشمی سہگل اپنے شوہر پریم سہگل کے ساتھ کانپور آ گئیں اور ڈاکٹر لکشمی سہگل نے اپنی پریکٹس شروع کر دی۔

کانپور میں وہ اس وقت اکیلی لیڈی ڈاکٹر تھیں جنھوں نے ریفیو جی لوگوں کے علاج کا کام کیا۔ لکشمی سہگل کی پوری زندگی غریبوں کے لیے وقف تھی۔ کمزور اور بے بس عورتوں میں انھوں نے نئی زندگی کو جینے کا حوصلہ پیدا کیا۔

کیپٹن لکشمی سہگل ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے لڑیں اور زخمی لوگوں کا علاج کرتی رہیں ۔انھوں نے اپنی پوری زندگی غریبوں کا مفت علاج کیا۔ وہ ارادے کی پکی تھیں اور کسی بھی انسان کو مشکل میں دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ چاہے بنگلہ دیش بننے کے بعد کلکتہ میں آئے ریفیو جی کی صحت یا پھر 84 کے دنگے میں سکھوں کی دیکھ بھال ،کانپور ،الٰہ آباد ،لکھنؤ یا پھر بھوپال گیس سانحہ ہو۔ وہ ہر جگہ اپنے عملے کے ساتھ پہنچ جاتی تھیں اور تیمارداری کے کام میں لگ جاتی تھیں۔

ڈاکٹر لکشمی سہگل کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی سبھاشنی اور چھوٹی انیسا ہیں۔ سبھاشنی علی اپنی والدہ ڈاکٹر لکشمی سہگل اور اور والد پریم سہگل کے نقش قدم پر چل کر آگے بڑھ رہی ہیں اور ٹریڈ یونین کی فعال اور ایماندار لیڈر ہیں۔ 1989 میں وہ کانپور سے مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی سے ممبر پارلیمنٹ رہیں ۔ان کی شادی فلم ساز، شاعر اور فنکار مظفر علی سے ہوئی۔ سعد علی ان کے صاحبزادے ہیں جنھوں نے فلم ساتھیا، بنٹی اور ببلی ،جھوم برابر جھوم جیسی فلمیں بنائیں۔

ڈاکٹر لکشمی سہگل کی پوری زندگی عوام کی خدمت اور عورتوں کو مضبوط بنانے ان کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کی جدوجہد سے بھری ہوئی تھی ۔ان کا ماننا تھا کہ اگر خواتین مضبوط ہوں گی تو ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔

ڈاکٹر لکشمی سہگل سے ہماری پہلی ملاقات آگرہ میں ہوئی۔ ان کو ہم لوگ ممی ہی کہتے تھے۔ میں ان کی سادگی، کم گوئی اور معصومیت سے بیحد متاثر تھی ۔ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی جو پہلی ملاقات میں ہی اپنا بنا لیتی تھی۔ وہ اکھل بھارتیہ جنوادی مہیلا سمیتی کی بانی تھیں ۔انھوں نے کبھی آسان راستہ نہیں چنا۔ وہ جہاں بھی انسانوں پر ظلم ہوتا دیکھتیں وہیں دوڑ پڑتیں تھیں۔ ہر جگہ طبی خدمات کے لیے وہ موجود ہوتی تھیں ۔ایک عورت جو بچپن سے پورے ۹۷ سالوں تک بلکہ ایک پوری صدی پر محیط اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو انسانی خدمات کے لیے وقف کر دیے۔ ہمیں ان کی زندگی سے سبق لینے کی ضرورت ہے ۔اور آج ہمیں عورتوں کے مسائل کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ جب تک ہم سنجیدہ نہیں ہوں گے عورتوں کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ آج کی حساس خواتین اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ ہمیں خود اپنے حالات بدلنے کے لیے آگے آنا ہوگا۔

ڈاکٹر کیپٹن لکشمی سہگل کو 2002 میں صدر جمہوریہ ہند کی امیدوار بنایا گیا۔ مگر وہ جیت نہ سکیں۔ 1998 میں کیپٹن ڈاکٹر لکشمی سہگل کو حکومت ہند نے پدم وبھوشن سے نوازا تھا۔ آزاد ہند کی پہلی خاتون کیپٹن لکشمی سہگل نے 97 سال تک ہندوستان خاص طور پر غریبوں کی خدمت کرتے ہوئے 23 جولائی 2012 کو اس دنیا کو الوداع کہا۔

جس طرح کیپٹن لکشمی سہگل کی پوری زندگی جدوجہد کرتے ہوئے گزری۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی وہ ہمت نہیں ہاریں اور سنجیدگی سے کام کرتی رہیں۔ وہ جو کرنا چاہتی تھیں وہ انھوں نے کر کے دکھایا۔ غریبوں بے سہارا عورتوں، مزدوروں اور زخمیوں کی طبی خدمات کرتی رہیں۔ وہ عورتوں کی اصلاح کرتی رہیں ۔انھیں ہمت اور حوصلہ دیتی رہیں۔ انھیں اپنی طاقت اور اپنی صلاحیت کو پہچاننے کے لیے بیدار کرتی رہیں۔ وہ یہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ہمارا ملک تبھی ترقی کر سکتا ہے جب ہم عورتوں کو ساتھ لے کر چلیں گے۔ ان کی طاقت کو پہچانیں ،انھیں موقع فراہم کریں۔ جبکہ 1914 میں ہی اینی بیسنٹ نے ہندوستان کے لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا:

"اگر وہ اپنی اور اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں تو انہیں عورتوں
کی حالت کی اصلاح کرنی چاہیے"

(شمیم نکہت ۔آزادی نسواں کی جدوجہد، آج کل، ص:9)

آج عورتوں کی مختاریت Empowerment بھی بحث کا موضوع بن چکی ہے۔ حکومت آج خواتین کے مسائل حل کرنے میں لگی ہے۔ کیونکہ خواتین کو ان کے حقوق فراہم کرنا ہی خواتین کی مکمل آزادی ہے۔

خواتین کو مکمل آزادی دلانے کے لیے اپنی پوری زندگی لگا دینے والی مجاہد آزادی اور آزاد ہند فوج کی رانی جھانسی رجیمنٹ کی طاقتور کمانڈر کیپٹن لکشمی سہگل خواتین اور ملک کے لیے مثال تھیں۔ میں نے اپنی ملاقات میں ان کے جذبے اور سادگی کو دیکھا ہے۔ ان کے کیے کارناموں کو یاد کرنا ہمارا فرض ہے۔

□□□

Dr. Nasreen Begam (Alig)
Head Dept. of Urdu
Baikunthi Devi Girls (P.G) College
Agra-282001 (U.P)

شاعرات کے منتخب اشعار

ہر ایک قلب پر اک زخم اک ستارا ہے
کبھی تو موت کبھی زندگی نے مارا ہے

کھنڈر ہوئی اس طرح دل کی یہ بستی
زمانہ بیت گیا اب کسی کی راہ نہیں

مریم غزالہ

کرم کا سلسلہ جاری بہت ہے
اسی سے خوف سا طاری بہت ہے

ہاتھوں میں ان کے سنگ گراں آج بھی وہی
مجھ کو محبتوں کا گماں آج بھی وہی

فاطمہ وصیہ جائسی

اب تری یاد بھی یوں آتی ہے
گزرے موسم کی صدا ہو جیسے

یہ ایک پل بھی غنیمت ہے آؤ مل بیٹھیں
مرے حبیب سنا ہے کہ زندگی کم ہے

حسنٰی مسرور

آنچلوں کی خوشبو میں کوئی رنگ سا چھلکے
موتیے کی کلیوں کو نیم خواب سا دیکھوں

میں آنسوؤں کا چراغاں لیے کہاں جاؤں
کہ ساتھ ساتھ ہے بن اور چاند سا چہرہ

عرفانہ عزیز

ہر اک تلاش کا حاصل تو بس یہی نکلا
کہ جس کو ڈھونڈا وہی شخص اجنبی نکلا

کھلی جو آنکھ تو پت جھڑ کا راج تھا ہر سو
مجھے پکار کے ساون چلا گیا شاید

ناہید اختر

شہر میں، دشت میں، گلزار میں کب جاتی ہے
میری آواز مرے گھر میں ہی دب جاتی ہے

ہزار صدیوں سے دیوار و در میں قید ہوں میں
ذرا سی دیر پروں کو مری اڑان تو دے

رفیعہ شبنم عابدی

نہ کوئی جادہ نہ منزل مگر سفر میں ہوں
مثال موج سرابوں کے رہ گزر میں ہوں

میں اس کی گرد ہٹاتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں
وہ آئینہ ہے مجھے خود شناس کر دے گا

وفا لکھنوی

تری یادیں ہیں اور تنہائیاں ہیں
غضب کی انجمن آدائیاں ہیں

جذبوں کا اک طلسم ہے یادوں کا سلسلہ
راہِ وفا سے تاحدِ امکان آرزو

سیدہ شان معراج

خواجہ عبدالمنتقم

عدلیہ میں خواتین کی حصہ داری

کوئی بھی ملک ہو، تہذیب، معاشرہ یا ثقافت یا شعبۂ حیات، اس میں عورتوں کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی بھی ملک میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں اکثریت میں نہیں ہیں اور روزگار و ملازمت کے معاملے میں بھی خواتین آج بھی مردوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ اور یوروپ کے ترقی یافتہ ممالک، جو خواتین کے حقوق کے بڑے حامی ہیں، وہاں پر بھی خواتین کا روزگار اور ملازمتوں میں حصہ بہت کم ہے جبکہ دنیا کے بیشتر دساتیر اور اقوام متحدہ کی خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق دستاویزات میں انھیں برابری کا درجہ دیا گیا ہے۔ خود ہلیری کلنٹن نے بھی، جو امریکہ کی صدارتی امیدوار تھیں، کئی سال قبل الیکشن کی مہم میں صنفی مساوات کے حوالے سے یہ بیان دیا تھا:

'میں بھی دنیا کی لاکھوں عورتوں کی طرح ایک عورت ہوں اور میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں کہ آج بھی خواتین کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں اور ان کے ساتھ امتیاز بھی برتا جاتا ہے اور وہ بھی اس انداز سے جو ظاہر نہ ہو۔ میں امریکہ کی ایسی تعمیر نو کی خواہاں ہوں جس میں ہر شخص کی قوت خوابیدہ بیدار ہو سکے۔'

(ہم نے اس بیان کا حوالہ کسی سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں دیا ہے۔ یہ تو محض عصری آفاقی صورت حال کی جانب مبنی بر حقیقت اشارہ ہے)

یہ صورت حال تو اس وقت ہے جب کہ بیشتر ممالک کے تمام قوانین gender neutral ہیں اور ان کا اطلاق مردوں اور عورتوں پر مساوی طور پر ہوتا ہے۔ اگر ہم اعداد و شمار کی بھی بات کریں تو اس سے بڑا

ثبوت اور کیا ہوگا کہ دنیا کی آبادی میں عورتوں کا حصہ لگ بھگ برابر ہے لیکن انھیں حاصل ہونے والی آمدنی دنیا کی کل آبادی کا 10 فیصد ہے یعنی 90 فیصد حصہ مردوں کو جا رہا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی اس سے بدتر صورت حال ان کی جائیداد کی ملکیت کے معاملے میں ہے۔ وہ صرف ایک فیصد جائیداد کی مالک ہیں اور 99 فیصد جائیداد پر مردوں کا قبضہ ہے۔

آیئے اب اس پس منظر میں ہم عدلیہ میں خاص کر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں خواتین کی ناکافی نمائندگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ قانون سازیہ، عدلیہ اور عاملہ کسی بھی ملک کے قانونی نظام کا جزو لاینفک ہوتے ہیں۔ قانون سازیہ قانون بناتی ہے، عدلیہ اس کی تعبیر کرتی ہے اور فیصلے صادر کرتی ہے اور عاملہ ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری کارروائی کرتی ہے۔ اس لیے جمہوریت کے ان تینوں ستونوں کی معیاری حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے حسب ضرورت عملہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستان کا قانونی وعدلیاتی نظام دنیا کے قدیم ترین نظاموں میں سے ایک ہے۔ یہ اپنی ہزار ہا سال کی تاریخ میں دنیا کے لیے ایک مثالی نظام بنا رہا ہے۔ یہ تاریخ کے مختلف ادوار میں بدلتا رہا مگر اس پر کبھی قدغن نہیں لگا اور یہ ہمیشہ رواں دواں رہا۔ آزادی کے بعد سپریم کورٹ 1950 میں آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی وجود میں آ گئی تھی لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس کے قیام کے بعد تقریباً چار دہائی تک سپریم کورٹ میں کوئی بھی خاتون جج نہیں تھی۔ 30 اپریل، 1927 کو تراونکور کے ایک مقام پتنم تٹا، جو اس وقت ریاست کیرالہ کا حصہ ہے، میں انا ویتل میر صاحب اور خدیجہ بیوی (بی بی) کے گھر پیدا ہونے والی لائق اور ہونہار بیٹی فاطمہ بیوی (بی بی) کی 1989 میں سپریم کورٹ کی پہلی خاتون جج کی حیثیت سے تقرری نے ice breaker کا کام کیا یا اگر دیا شنکر نسیم کی زبان میں کہا جائے تو 'کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'۔ ان کی تقرری عدلیہ (judiciary) سے ہوئی تھی۔ وہ سپریم کورٹ میں تقرری سے قبل تمل ناڈو ہائی کورٹ کی جج رہیں اور وہاں سے سبکدوش ہونے کے کچھ عرصہ بعد سپریم کورٹ کی جج مقرر ہوئیں۔

گزشتہ 71 سال میں سپریم کورٹ میں 247 ججوں کی تقرری ہوئی۔ ان میں خواتین کی تعداد صرف 8 تھی۔ یہ خوش نصیب خواتین ہیں:

1	فاطمہ بیوی (بی بی)	اکتوبر1989 تا 29اپریل1992
2	سجاتا منوہر	8نومبر1994 تا 27اگست1999
3	روما پال	28جنوری2000 تا2جون2006
4	گیان سدھا مشرا	30اپریل2010 تا27اپریل2014
5	رنجنا دیسائی	13ستمبر2011 تا 29اکتوبر2014
6	آر بھانومتی	13اگست2014 تا19جولائی2020

7 اندوملہوترا 27اپریل2018 تا 13مارچ2021

8 اندرابنرجی 7اگست2018 سے تاہنوز۔ان کی مدت کار 23 ستمبر 2022 تک ہے۔

مندرجہ بالاتفصیل سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ خواتین کوسپریم کورٹ کا جج بننے کا موقع وقفہ وقفہ سے ملا ہے اور یہ سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ مسلسل جاری رہنے کی بجائے وقفہ وار رہا۔ غالباًاس کی وجہ ہائی کورٹ اور ذیلی عدالتوں میں خاتون ججوں کا کم تناسب رہی۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اس کمی کو دور کرنے کے لیے آئین کی دفعہ 127 کے تحت ،جس کی عبارت درج ذیل ہے، وقتی طور بھی ججوں کی تقرری کی جاسکتی تھی۔علاوہ ازیں، آئین کی دفعہ 124 کے فقرہ(3) کا سہارا لے کر ممتاز وکلاء کی بھی سپریم کورٹ میں بطور جج تقرری کی جاسکتی تھی۔

ایڈہاک ججوں کا تقرر۔(1)اگر کسی وقت سپریم کورٹ کے ججوں کا کورم عدالت کے کسی اجلاس کو منعقد کرنے یا جاری رکھنے کے لیے پورا نہ ہوتو بھارت کا چیف جسٹس صدر کی ماقبل منظوری سے اور متعلقہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے صلاح کے بعد کسی ہائی کورٹ کے کسی ایسے جج کی جو سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے تقرر کیے جانے کی باضابطہ اہلیت رکھتا ہو اور جسے چیف جسٹس نامزد کرے ایڈہاک جج کی حیثیت سے اتنی مدت کے لیے جوضروری ہو عدالت کے اجلاسوں میں شرکت کی تحریری استدعا کر سکے گا۔

(2)اس طرح نامزد کیے ہوئے جج کا فرض ہوگا وہ اپنے عہدے کے دیگر فرائض پر ترجیح دے کر سپریم کورٹ کے اجلاسوں میں اس وقت اور اس مدت کے لیے جس میں اس کی شرکت درکار ہو شریک ہو اور جب وہ اس طرح شریک رہے تو اس کو سپریم کورٹ کے جج کے تمام اختیار سماعت، اختیارات اور مراعات حاصل ہوں گی اور وہ اس کے فرائض انجام دے گا۔

علاوہ ازیں ججوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے دفعہ 124 کے فقرہ(3) کے تحت اہل وکلا اور ممتاز قانون داں کو بھی مناسب تعداد میں جج مقرر کیا جاسکتا تھا۔

دفعہ124 کے فقرہ(3) کے مطابق کوئی شخص سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے تقرری کا اہل نہ ہوگا اگر وہ بھارت کا شہری نہ ہو، اور(الف) کسی ہائی کورٹ کا یا دو یا دو سے زیادہ ایسی عدالتوں کا کم سے کم متواتر پانچ سال تک جج نہ رہا ہو، یا(ب) کسی ہائی کورٹ کا یا دو یا دو سے زیادہ ایسی عدالتوں کا کم سے کم متواتر دس سال تک ایڈوکیٹ نہ رہا ہو، یا (ج) صدر کی رائے میں ایک ممتاز قانون داں نہ ہو۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ ایک طویل عرصہ کے بعد ایک ممتاز قانون داں اور سینئر ایڈووکیٹ اندوملہوترا کو28اپریل2018 کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ اندوملہوترا بار سے جج بننے والی پہلی خاتون تھیں جواب اپنی تین سالہ مدت کار کو پورا کرنے کے بعد سبکدوش ہو چکی ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آج تک کوئی بھی خاتون بھارت کے چیف جسٹس کا موقر عہدہ حاصل نہیں کر سکی۔

جہاں تک ہائی کورٹوں کی بات ہے وہاں بھی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ وزارت داخلی امور کے تحت آنے والے محکمۂ انصاف کی ویب سائٹ پر دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ہائی کورٹوں میں کل ملا کر ججوں کی تعداد1079 ہے۔ ان میں خواتین کی تعداد صرف 82 ہے(یہ تعداد نئی تقرریوں اور سبکدوشی کے سبب بدلتی رہتی ہے)۔

جہاں تک ذیلی عدالتوں کی بات ہے وہاں صورت حال قدرے بہتر ہے لیکن اطمینان بخش نہیں۔ ہمارے ملک میں خواتین کی آبادی تقریباً 48% ہے لیکن خاتون ججوں کی تعداد28% سے بھی کم ہے۔

یہ امر بھی باعث تشویش ہے کہ خواتین دوست غیر سرکاری انجمنوں اور وکلا کی تنظیموں کی پیہم جدوجہد اور ارباب حکومت کے نیک ارادوں اور مثبت فکر کے باوجود ابھی تک خواتین کو زندگی کے تمام اہم شعبوں بشمول عدلیہ میں برابر حصہ داری نہیں مل پائی ہے اور وہ آج بھی اتنی بااختیار نہیں ہیں جتنی کہ مرد۔ اب تک عالمی پیمانے پر خواتین سے متعلق جتنی بھی کانفرنسوں کا انعقاد ہوا ہے، جن میں بیجنگ کانفرنس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، ان میں بار بار اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ خواتین کو مساوی حقوق ملنے چاہئیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ 1995 میں منعقد بیجنگ کانفرنس کے بعد خواتین کے حقوق کے تحفظ اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کی حصہ داری جیسے معاملات میں کافی پیش رفت ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھیں آج بھی مردوں کے برابر حقوق حاصل ہونے کے باوجود مساوی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں قانون کی رو سے انھیں مساوی حقوق حاصل بھی ہیں وہاں بھی زمینی حقیقت اس کے اگر مکمل طور پر متضاد نہیں تو کم از کم مکمل صنفی مساوات کی عکاس نہیں۔

□□□

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Apartments
2-I.P.Extn.
Delhi-110092
Mob. 9818369624

شمس الہدیٰ انصاری (علیگ)

شکیلہ بانو بھوپالی
ایک شاعرہ

شکیلہ بانو بھوپالی 7 مئی 1942 کو عبدالرشید اور جمیلہ بانو کے یہاں پیدا ہوئیں۔ یہ گھرانا گانے بجانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے والد بھی قوال تھے۔ ریاستی دور میں شادی بیاہ اور نجی تقریبات میں بہت کم معاوضے پر گایا کرتے تھے۔ شکیلہ بانو کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید سے ہوئی۔ اسلام پورہ کی گلی میں ان کا مکان تھا۔ جس گلی میں اسد بھوپالی رہا کرتے تھے۔ مدرسے میں قرآن کے ساتھ اردو کی تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے ہی ذہن نغمگی کی جانب مائل تھا۔ عمر بڑھی تو باپ نے انھیں بھی قوالی کے ہنر سے آراستہ کیا اور جوانی نے جب شباب کی انگڑائی لی تو شکیلہ اس فن میں طاق ہو چکی تھیں۔ کم عمری میں ہی ان کی شادی قوال عبدالرشید سے ہوگئی، لیکن زیادہ عرصہ تک یہ شادی قائم نہیں رہی اور طلاق ہوگئی۔

آہستہ آہستہ ان کی شہرت بھوپال کے اطراف میں بھی ہونے لگی۔ 1956 میں مدھیہ پردیش وجود میں آیا اور بھوپال کو راجدھانی بنا دیا گیا۔

اسی سال دلیپ کمار اور بی آر چوپڑے یونٹ کے ساتھ فلم 'نیا دور' کی شوٹنگ میں حصہ لینے بھوپال آئے تو ان کے اعزاز میں شکیلہ بانو نے قوالی پیش کی۔ شکیلہ کے عشوہ و انداز اور مہذب انداز گفتگو سے متاثر ہو کر اپنی قسمت آزمانے کے لیے دلیپ کمار نے شکیلہ کو بمبئی مدعو کر لیا۔ اس سے قبل کہ یہ دعوت بے اثر ہو وہ بمبئی پہنچ گئیں۔ دلیپ کمار سے ملیں اور دلیپ کمار کے علاوہ دیگر فلمی ہستیوں نے جب ان کی قوالی سنی تو مبہوت رہ گئے۔ کھانے رہنے کا انتظام تو ہو گیا، قوالی کے پروگراموں سے آمدنی خاصی ہو جایا کرتی تھی۔ دو سال تک وہ فلموں میں کام کرنے کی جدوجہد کرتی رہیں۔ شکیلہ نے ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں قوالی پیش کی اور کامیابیوں کی بلندیوں سے سرشار ہوئیں۔

بہار مجودہ جھارکھنڈ کے شہر جھریا کے اینہ اسلام پور اور گریڈیہہ میں درجنوں بار آ کر قوالی کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کرایا۔ قوالی سننے والے ان کے دیوانے ہو گئے۔ جھارکھنڈ کے ان تمام قوالی پروگرام کے روح رواں قیوم نشاط مرحوم ہوا کرتے تھے۔

1958 میں نوشکتی فلز نے شکیلہ کو اپنی سی کلاس کی فلم 'جنگل پرنس'

میں اداکاری کرنے کا موقع دیا۔ یہ فلم اے، آر، زمیندار کی ہدایت میں بنی تھی اور کامران اس فلم کے ہیرون تھے۔ شکیلہ بانو کی آواز چونکہ پلے بیک کے لیے موزوں نہیں تھی اس لیے پہلے ہی فلم میں ان کے لیے مبارک بیگم کا پلے بیک لیا گیا تھا۔ پہلی فلم چونکہ سی کلاس تھی۔ اس لیے انھیں آگے بھی سی کلاس فلمیں ہی ملتی رہیں۔ 1959 'لیڈی رابن ہڈ'، 'طوفانی تیر انداز' اور 'رانگ نمبر' 1960 میں آئی۔ 1960 'چوروں کی بارات'، 'لالچ'، 'شریف ڈاکو'، 'نخرے والی'۔ 1970 میں 'زیارت گاہ ہند' آئی۔ 1974 'دستک'، 1975 'مزے لے لو' اور 1996 ہمراہی۔ فلم 'نخرے والی' میں موسیقار نرمل کمار نے شکیلہ کی آواز میں شعری بھوپالی کی غزل 'تصور سے دل وجاں میں اجالا کرلیا میں نے' کو قوالی کی طرز میں ریکارڈ کیا تھا۔

1974 میں راجندر سنگھ بیدی شکیلہ کو اپنی فلم 'دستک' میں نسبتاً Negative رول دیا تو 1996 میں راما نند ساگر نے اپنی مزاحیہ فلم 'ہمراہی' میں ان سے مزاحیہ اداکاری بھی کرائی تھی۔ راما نند ساگر اور راجندر سنگھ بیدی، شکیلہ کے حسن، ان کے فن اور ان کے عشوہ وانداز کے دیوانے تھے۔

شکیلہ بانو کو اتنی دولت فلموں سے تو نہیں ملی، جتنی دولت 'انھوں نے پرائیویٹ پروگراموں سے کمائی۔ ان کے پروگرام بیرون ملک میں بھی ہوئے ایرانڈیا جیسی دیگر اہم کمپنیاں بھی ان کے قوالی کے پروگرام منعقد کیا کرتی تھیں۔ شکیلہ نے جو دولت کمائی اسے ضائع نہیں ہونے دیا۔ اس کمائی ہوئی دولت سے انھوں نے سب سے پہلے کھار بمبئی کے مغربی لوکل اسٹیشن سے نزدیک ایک وسیع عمارت خریدی اور اس میں رہنے لگیں۔ بھوپال میں قدسیہ پارک پرانا قلعہ کے نزدیک ایک پرانا مکان خرید کر نئی وسیع عمارت تعمیر کی، جس میں ان کی والدہ، بھائی وغیرہ رہنے لگے۔ شکیلہ بمبئی سے آکر اسی مکان میں ٹھہرتیں اور رات گئے تک اس مکان میں شعری محفلیں منعقد کی جاتیں۔ چونکہ خود بھی شاعرہ تھیں، اپنی غزلیں سنانا ان کا شوق تھا۔ ان کی دلبستگی کے لیے بھوپال کے شاعر ان کی محفلوں میں شریک ہونا باعث سعادت وافتخار سمجھتے۔ جنھیں سننے کے لیے کل ہند مشاعروں میں ہجوم بے قرار رہتا تھا۔ اختر سعید خان، تاج بھوپالی، عشرت قادری شعری بھوپالی کے علاوہ اور کئی شاعر وادیب شرکت کیا کرتے تھے۔ یہی نہیں ان کے ناز و ادا نے راجندر سنگھ بیدی راما نند ساگر، علی سردار جعفری اور کئی اہم ہستیوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا ہندوستان میں دانشوروں نے جتنی تعریف وتوصیف شکیلہ بانو کی کسی دوسرے قوال کو حاصل نہیں۔

شکیلہ بانو جب سخت علیل ہوئیں اور ان کے حالات کچھ اتنے خراب ہوگئے کہ وہ اپنے علاج کے لیے مکان، زیور اور قیمتی اشیا بیچنے پر مجبور ہو گئیں تھیں اور ایک چھوٹے سے فلیٹ میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزاری۔ حیدرآباد میں شکیلہ بانو بھوپالی کی بے پناہ مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار شاہد صدیقی نے باتوں باتوں میں شکیلہ بانو بھوپالی سے پوچھ لیا۔ ''تم شکیلہ ہو کہ بانو ہو کہ بھوپالی ہو۔''

اس پر مخدوم محی الدین نے بے ساختہ مصرعہ ثانی کہہ کر شعر کو یوں مکمل کیا تھا۔

خیر کچھ بھی ہو مگر ماہر قوالی ہو!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب شکیلہ بانو بھوپالی کا دن اپنے عروج پر تھا۔ 60 کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں شکیلہ نے وہ شہرت حاصل کی جو بہت کم کے حصہ میں آئی۔ شکیلہ بانو کے پروگرام کو دیکھنے سننے کے بعد بوڑھے بھی 'ضرورت شعری' کے تحت اپنے آپ کو جوان محسوس کرنے لگتے تھے۔ ایسے میں اندازہ لگایئے کہ نوجوانوں کے دلوں پر کیا نہ گزرتی ہوگی۔ شکیلہ بانو کا فن حسن، نوجوانی، شعر ونغمہ اور ناز کے خوبصورت امتزاج سے عبارت تھا۔

شکیلہ بانو بھوپالی کے پروگرام میں شرکت کرنے کے بعد ایک عجیب سی سرشاری طاری ہوجاتی تھی۔ اس لیے کہ اس طرح کا پروگرام ایک انوکھی بات تھی۔ موسیقی کی بہت سی محفلوں میں شرکت کی ہے۔ رقص وسرود کی محفلوں سے آشنا ہیں۔ لیکن شکیلہ بانو بھوپالی کا فن ان سب سے مختلف تھا۔ انھوں نے شعر، نغمہ، طرز ادا، برجستگی، حاضر جوابی اور والہانہ پن کے امتزاج سے ایک ایسا فن ایجاد کیا تھا جو ان کا اپنا تھا۔ بعد میں بہت سوں نے شکیلہ بانو کی تقلید کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔ وہ اس فن کی موجد تھیں اور یہیں ان کی انفرادیت تھی۔ کسی بھی شعر کو پیش کرتے ہوئے وہ سراسر مجسم شعر بن جایا کرتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے شعر ان کی ذات میں ڈھل کر تخلیق ہو رہا ہو۔ شعر میں انگڑائی کا ذکر ہوتا تو انگڑائی کے عمل کو اپنے جسم کے مختلف زاویوں سے مختلف انداز کے ساتھ پیش کرتی تھیں۔ معشوق کے انتظار کا بیان ہوتا تو ان کا جسم سراپا انتظار بن جاتا اور ان کا روم روم انتظار کی کیفیت میں ڈوب جاتا۔ بہار کی آمد کا بیان ہوتا تو ان کے وجود میں کلیاں سی چٹکنے لگ جاتیں اور یوں محسوس ہوتا جیسے بادصبا کے جھونکے سارے ماحول کو معطر کر رہے ہیں۔ لگتا تھا شاعر نے اپنے قلم سے نہیں بلکہ شکیلہ بانو بھوپالی کے سراپے کی مدد سے شعر کی تخلیق کی ہے۔ شکیلہ بانو شعر وادب کا بے حد اچھا ذوق رکھتی تھیں بلکہ خود شاعرہ بھی تھیں۔ اس لیے شعر کا مفہوم ان کے جسم میں ڈھل کر اور بھی معنی خیز اور تہہ دار ہوجایا کرتا تھا۔ شکیلہ بانو اپنے فن کو کچھ اس طرح پیش کرتی تھیں کہ ان

کے سامعین ایک منزل پر پہنچ کر خود پروگرام کا حصہ بن جاتے تھے، چاہے ان کی تعداد ہزاروں میں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنی حاضر جوابی، دہانت، فطانت اور بذلہ سنجی کو کچھ اس طرح بروئے کار لاتیں اور سامعین سے کچھ اس ادا سے مخاطب ہوتیں کہ لگتا تھا۔ جیسے وہ سامعین نہیں بلکہ ان کے ہم نوا ہیں۔ شکیلہ بانو بھوپالی کے پہلے ہی پروگرام کے بعد حیدرآباد کی گلی گلی میں ان کی دھوم مچ گئی۔

مخدوم محی الدین نے شکیلہ بانو کے بارے میں ایک شعر کہا تھا:

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدوم
تذکرے رستوں میں چرچے ہیں پری خانوں میں

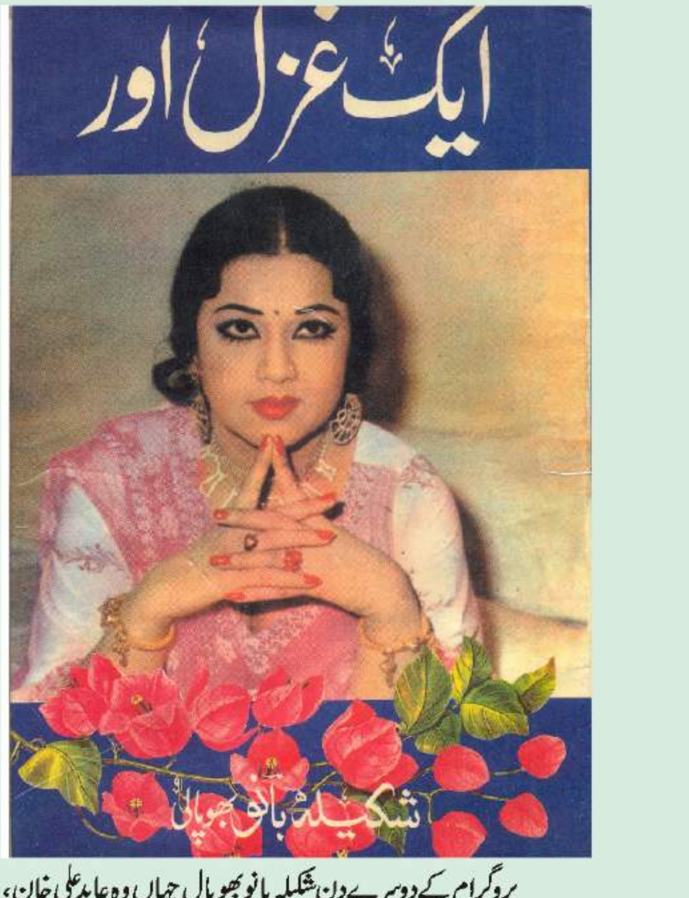

پروگرام کے دوسرے دن شکیلہ بانو بھوپال جہاں وہ عابد علی خان، محبوب حسین جگر اور شاہد صدیقی سے ملنے آئی تھیں! حسن اور خوبصورتی اپنی جگہ لیکن وہ رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے نہایت سیدھی سادی، قبول صورت سی خاتون نظر آئیں۔) ہم نے (مجتبیٰ حسین) حیرت سے دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا تھا ''کیا یہی وہ محترمہ ہیں جو کل رات اسٹیج پر قیامت ڈھا رہی تھیں اور بجلیاں گرا رہی تھیں۔'' سچ ہے فنکار کو اس کے فن کے ساتھ دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ عابد علی خان اور محبوب حسین جگر کا وہ بہت احترام کرتی تھیں اور جب بھی حیدرآباد آتیں تو ایک طرح سے ان ہی کی مہمان ہوتیں۔ اسی حوالے سے وہ انھیں بے حد عزیز رکھتی تھیں۔

حیدرآباد سے شکیلہ بانو کو بے حد لگاؤ رہا ہے۔ دنیا کے کئی ممالک جیسے افریقہ، امریکہ، کناڈا، برطانیہ، سوئیزرلینڈ، جرمنی، مصر، کویت اور دبئی وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے بے شمار شہروں میں اپنے پروگرام پیش کر چکی ہیں۔ لیکن حیدرآباد کا ذکر سب سے پہلے کریں گی۔ اردو شعر و ادب سے انھیں بچپن ہی سے لگاؤ رہا ہے۔ ان کے والد اور تایا بھی شاعر رہ چکے ہیں۔

قوالی کے پروگراموں سے شکیلہ بانو کو جب بھی فرصت ملتی تھی تو وہ خود بھی شعر کہتی تھیں۔ 1994 میں ان کا شعری مجموعہ 'ایک غزل اور' کے عنوان سے چھپا تھا۔ کرشن چندر، اختر سعید خاں، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس جیسی نامور ہستیوں نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔ خوشونت سنگھ جب ''السٹریٹیڈ ویکلی'' آف انڈیا کے ایڈیٹر تھے تو انھوں نے ویکلی کے سرورق پر شکیلہ بانو بھوپالی کی تصویر چھاپی تھی اور ان کے فن پر اظہار خیال کیا تھا۔

شکیلہ بانو نے تاعمر اپنے خاندان سے رابطہ قائم رکھا، بھائیوں کی شادیاں کیں۔ ان کے بچوں کی پرورش کی۔ کسی مرحلے میں کمی نہ آنے دی۔ کہا جاتا ہے کہ زرینہ بانو جسے وہ اپنی بہن کہہ کر متعارف کراتی تھیں۔ دراصل ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک سازندے سے ہی آخری وقتوں میں شادی کر لی تھی۔

شکیلہ بمبئی سے واپس آ کر اپنے اس مکان 'جمیلہ منزل'' میں فروکش رہیں۔ محفلیں بھی اجڑ چکی تھیں۔ اب اکا دکا ہی لوگ ان سے ملاقات کو آتے تھے۔ عارضہ قلب کے ساتھ ذیابیطس میں مبتلا ہو گئیں۔ 15 دسمبر 2002 کی ایک سرد رات میں 60 سال کی عمر میں قوالی کی یہ ملکہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ ان کے انتقال کے بعد بھائیوں میں رنجشیں بڑھیں ایک بھائی انیس کے بیوی اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں سزا پا چکی ہیں۔ 'جمیلہ منزل' 85 لاکھ میں فروخت ہو گئی۔ شکیلہ بانو کے بعد پورا خاندان ہی منتشر ہو گیا۔

□□□

Shamsul Hoda Ansari (Alig)
Nishat Nagar
Wasseypur
Dhanbad-826001 (Jharkhand)
Mob: 8271638323

ڈاکٹر عبدالمغنی صدیقی

ناول 'آتش دان'
دیہی زندگی کا آئینہ دار

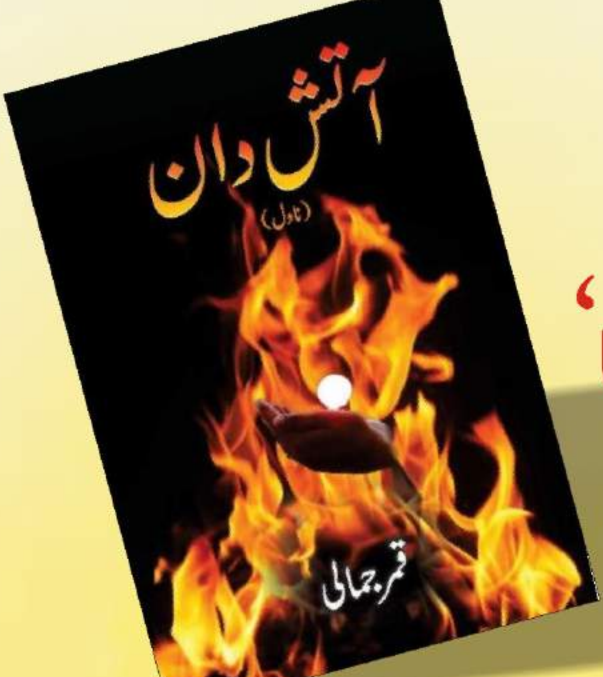

ہندوستان کی خوبصورتی دراصل اس کے دیہاتی علاقوں سے ہے اور ان ہی دیہی علاقوں میں اُگنے والا اناج مضبوط معیشت کی بنیاد ہے۔ آج بھی ہندوستان کی قومی آمدنی کا 70 فیصد حصہ زراعت سے آتا ہے۔ ہندوستانی حکومتوں نے بھی گاؤں کی ترقی، فلاح و بہود کے لیے ہمہ جہت اقدامات کیے ہیں۔تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دیہی زندگی کی کچھ تلخ حقیقتیں بھی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔مگر فکشن نگار محترمہ قمر جمالی صاحبہ نے اپنے ناول ''آتش دان'' میں ہندوستانی دیہی زندگی کے اسی تلخ اور حقیقی چہرے کو پیش کیا ہے۔

ناول کی کہانی تلنگانہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سورج پور سے شروع ہوتی ہے جہاں پر لینڈ مافیا سرگرم ہے جس کی پشت پناہی ایک بدکار سیاسی قائد کر رہا ہے۔ناول نگار نے ایک چھوٹے سے قصبہ کے ذریعہ ہندوستان کی اس تصویر کو پیش کیا ہے جس میں ہندوستان سالوں سے نہیں بلکہ صدیوں سے جل رہا ہے۔آزادی کے بعد سیاسی لیڈروں نے ہندوستان کو لوٹ کھسوٹ کی آماج گاہ بنالیا اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ جمہوری نظام نے جہاں عوام کو آزادی دی وہیں بعض سیاسی قائدین اپنے ظلم و جبر سے خود ہی مطلق العنان بن بیٹھے اور اپنے اپنے حلقہ اسمبلی کو ''آتش دان'' بنا دیا۔اس آتش دان کا ایندھن معصوم عوام بن رہی ہے اور اس کی روشنی سے سیاسی لیڈروں کے گھر اور خاندان آباد ہیں۔

کہانی کی ابتدا تجسس سے ہوتی ہے اور یہ تجسس ناول کے تقریباً سو صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔یہی تجسس قاری کی دلچسپی کا سبب بھی ہے۔ جب یہ تجسس ٹوٹتا ہے تب کہانی میں مزید نئے کردار اور واقعات منظر عام پر آتے ہیں۔ناول میں اہم مرکزی کردار ایک نوجوان شہباز خان کا ہے جو اپنی محنت سے گروپ ٹو کا امتحان کامیاب کرتا ہے اور سیول سروس میں داخل ہوتا ہے۔اس کردار کے ذریعہ ناول نگار نے ہندوستان کے نوجوانوں کو ظلم و زیادتی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی ہے۔ہندوستان کی آبادی کا پچاس فیصد حصہ نوجوانوں پر مبنی ہے۔ناول نگار نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اگر نوجوان بہتر مستقبل اور اپنے ملک کو ترقی کی سمت لے جانا چاہتے ہیں تو انھیں ظلم و جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ہمت ہونی چاہیے۔ محنت اور جستجو سے اپنے اور ملک کے مستقبل کو شاندار بنانا چاہیے۔

ناول کی ابتداء میں ''شہباز خان'' کا کردار کچھ متزلزل ارادوں والا معلوم ہوتا ہے۔ایک عام نوجوان کی طرح اس کردار میں تشویش اور خوف کی وجہ سے نامساعد حالات سے لڑنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ناول نگار نے ''شہباز خان'' کے کردار سے ایک عام ہندوستانی نوجوان کے دلی جذبات کو پیش کیا ہے جو حالات کے ہاتھوں مجبور تو تھا مگر اس کا نصب العین اس

قدر مضبوط تھا کا اس نے اپنے متزلزل ارادوں کو ایک نئی جلا بخشی اور تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوا۔ یہاں شہباز خان کا سامنا سورج پور میں پھیلے لینڈ مافیا اور واٹر مافیا سے ہوتا ہے۔ میر مدار کا کردار ہندوستانی جمہوریت کی حق وصداقت کی دلیل ہے۔

شہباز خان کی دادی کا ناول میں ثانوی مگر اہم کردار ملتا ہے۔ جس نے شہباز خان کو گروپ ٹو کا امتحان دلوایا، رات دن ایک کر کے اس کی تربیت اور تعلیم مکمل کروائی۔ دادی چاہتی تھیں کہ شہباز اپنے دادا کی موت کا راز جانے، مگر دادی نے اپنی حیات میں شہباز کو اس بات کی بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ اس کے دادا کا قتل ہوا تھا۔ یہ راض شہباز کو سورج پور میں پوسٹنگ کے بعد معلوم ہوتا ہے، یہیں سے کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ ناول میں جاگیرداری کے خاتمہ کے بعد ''سورج پور'' دیہات میں ریڈیوں کی ظلم وزیادتی کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس گاؤں میں زمین مافیا کے علاوہ پانی کا مافیا بھی کھلے عام متحرک ہے اور غنڈہ گردی ہوتی ہے، یہاں کا مقامی رکن اسمبلی راجیشور ریڈی ہے جو نہ صرف کسانوں کی زمین ہڑپ لیتا ہے بلکہ یہاں سے بہنے والی ندی پر بھی اس کا ناجائز قبضہ ہے۔ اس ندی کا پانی صرف اسی کے کھیتوں میں چھوڑا جاتا ہے۔ سورج پور میں آبی وزمین کے تنازعات عروج پر ہیں اور شہباز خان انھیں تنازعات کو حل کرنے کا عہد کرتا ہے۔

قمر جمالی نے اپنے ناول ''آتش دان'' میں اکیسویں صدی کے ہندوستانی دیہی نظام کو پیش کیا ہے۔ قمر جمالی نے اپنے ناول کے ذریعہ ہندوستانی دیہی نظام کے اس تلخ چہرے کو پیش کیا ہے جس پر سیاسی حضرات کی ہوس اور لالچ کے آہنی پنجوں کے نشانات موجود ہیں۔

ناول نگار نے ایک چھوٹے سے دیہات کے ذریعہ ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس ناول میں سیاسی لیڈروں کی انا پرستی اور انسان کی دم توڑتی قدیم سماجی زندگی دونوں کو پیش کیا گیا ہے۔ محترمہ قمر جمالی انسانی زندگی کی بدلتی قدروں پر متفکر بھی نظر آتی ہیں۔

> ''مگر اب۔۔۔یہ سب تو۔۔۔۔خوابوں کی باتیں ہو گئیں۔ بچوں کا دادی نانی سے کہانی سننا بھی کہانیوں کا حصہ بن گیا زمانہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ گیا کہ رشتوں کا تقدس پامال ہو گیا پرانے اقدار اُجلے آنچل اور پوپلے ہونٹوں کے تذکرے بن گئے اب کہاں وہ بڑے بڑے خاندان کہاں کہ صدر دالان اور کہاں وہ ایک دوسرے کی خیر خبر اور تو اور خود انسان اپنی ذات میں سمٹ گیا نہ اس کے آگے کچھ اور نہ پیچھے کچھ اب نہ وہ آتش دان رہے اور نہ آتش دانوں کے گرد بیٹھے معصوم چہرے سب کچھ کہاں کھو گیا!!۔''

(قمر جمالی، ناول آتش دان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2014، ص 13 تا 14)

سائنس اور جدید ٹکنالوجی نے صرف شہروں کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ گاؤں بھی اس میں پیش پیش رہے ہیں۔ ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، حمل ونقل کے ذرائع کے ساتھ ساتھ مشترکہ خاندان زوال پذیر ہوئے اور ان کی جگہ انفرادی خاندانوں نے لے لی۔ پہلے جہاں ایک ہی گھر میں ۴ سے زائد کمرے ہوا کرتے تھے اب شہروں میں یہ تعداد صرف اور صرف دو بیڈ روم تک سمٹ گئی ہے۔ اضلاع اور دیگر قصبات میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے۔ کچے مکانات کی جگہ آر سی سی کے پکے مکانات نے لے لی۔ پہلے خاندان کا ایک فرد ہی تین وقت کی روٹی کمانے کے لیے کافی تھا مگر آج ضروریات زندگی کچھ اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ شوہر کے ساتھ بیوی کا کمانا وقت کی اہم ضرورت میں شامل ہو چکا ہے۔ تعلیم کی اہمیت اور معیاری زندگی نے انسان کو نہ صرف یکسر بدل کر رکھ دیا بلکہ بہت حد تک مطلب پرست اور زر پرست بھی بنا دیا ہے۔

سورج پور کی کہانی بھی کچھ انھیں اقدار کا احاطہ کرتی ہے۔ حالاں کہ یہاں بھی ترقی کی رفتار کچھ کم نہیں تھی مگر راجیشور ریڈی نے اپنے سیاسی اثر ورسوخ کی بنیاد پر مقامی افراد کو بے بس، بے کس اور مجبور کر دیا ہے۔ شہباز خان، راجیشور ریڈی کے ظلم وستم کا معقول جواب دیتا ہے۔ جمہوری اُصول وضوابط کے ذریعہ شہباز خان، راجیشور ریڈی کو انتخابات میں شکست دیتا ہے۔ ناول میں قمر جمالی نے جمہوری اقدار کی اہمیت کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے نوجوانوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کا جمہوری نظام اتنا عمدہ ہے کہ یہاں کوئی بھی ظالم شخص زیادہ دنوں تک اپنی ظالمانہ حکومت چلا نہیں سکتا۔

ناول میں جہاں شہباز خان کا کردار مرکزی ہے وہیں راجیشور ریڈی، میر مدار اور دادی کے ثانوی کردار ناول کے واقعات کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ قمر جمالی نے SVF یعنی سورج پور والینٹرس فورس نامی آزاد خود مختار تنظیم کو پیش کیا ہے جو ظلم وزیادتی کے خلاف راجیشور ریڈی جیسے ظالم سیاست دانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ ہندوستان کے کئی اضلاع میں آج بھی پی ڈبلیو جی یعنی پیپل وار گروپ تنظیم (نکسلزم) کے نام سے متحرک ہے جو اکثر وبیشتر سیاسی لیڈروں کو اپنا نشانہ بناتی ہے اور کبھی کبھی خود پولیس کی گولی کا نشانہ بھی بن جاتی ہے۔

ناول میں تجسس شہباز خان کے سورج پور میں ٹرانسفر کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کا اختتام راجیشور ریڈی کے (ایس وی ایس) کے

ہاتھوں قتل ہونے اور آبی مسئلہ کے حل کے ساتھ انجام کو پہنچتا ہے۔ یہاں پر شہباز خاں کا مقابلہ ایک زمیندار، منصب دار، جاگیردار سے نہیں بلکہ ان سب کے ماہر یعنی ایک سیاست دان ہے، پھر بھی شہباز خان اپنی حکمت عملی سے اسے زیر کرتا ہے۔

شہباز خان اور راجیشور ریڈی کی گفتگو ملاحظہ ہو:

> ''اس دن! وہ اچانک میرے اجلاس میں گھس آیا اور دھڑلے سے میرے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔
> ''آفیسر۔! میر مدار کے پر نکل آئے ہیں۔ اڑان بھرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کون سی طاقت کارفرما ہے''
> ''اب وہ میرے محکمہ کا آدمی نہیں ہے''۔ ''محکمہ کا نہیں، آدمی تو آپ ہی کا ہے۔''
> ''ہم جنگل کے تنہا شیر ہیں۔''
> اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا کہ جنگل کا شیر کتنا بے بس تھا
> ''ہم آگاہ کرنے آئے ہیں''
> میں پھر بھی خاموش رہا
> ''ہم چاہیں تو اُس چیونٹی کو مسل کر پھینک دیں گے۔ یوں۔''
> اس نے سامنے رکھی سیاہی کی بوتل کو اس زور سے میز پر دبایا کہ بوتل ٹوٹ گئی۔ اور ہاتھ لہولہان ہو گیا۔''

(قمر جمالی، ناول آتش دان، ص 155)

صرف پانچ سالہ دورِ اقتدار نے راجیشور ریڈی کو مطلق العنان بنا دیا ہے۔ بے عقل، جاہل اور ظالم جب سیاست داں بن جائے تو وہ کس قدر قوم، ملک اور انسانیت کو شرمسار کرتا ہے مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہے۔ راجیشور ریڈی اپنی غنڈہ گردی اور روپیہ کے زور پر سورج پور کے رکن اسمبلی کی سیٹ پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ ہندوستانی عوام خواہ وہ شہر میں رہتی ہو یا پھر دیہات اور قصبات میں غنڈوں اور لٹیروں سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے۔ ایشاء میں ہندوستان ان ممالک میں شامل ہے جہاں کی عوام زمانہ قدیم سے غنڈوں اور بے ایمانوں کے زیر اثر رہی ہے۔ امراء، جاگیردار، زمیندار کے ظلم کے علاوہ قوموں نے غنڈہ گردی کو ہر شکل میں دیکھا اور اس کے ظلم و ستم کو برداشت کیا ہے۔ آج ہندوستانی عوام سیاسی لیڈروں کے ظلم و ستم کو بھی برداشت کرتی ہے اور وقت آنے پر انھیں زبردست سزا بھی دیتی ہے۔ شہباز خاں، راجیشور ریڈی کی بدتمیزی اور بد اخلاقی کا بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیتا ہے۔ قمر جمالی نے یہاں ووٹ اور جمہوری اقتدار کی طاقت کی جھلک پیش کی ہے۔

محترمہ قمر جمالی نے اپنے ناول کے ذریعہ عوام خاص کر نوجوان طبقے میں جوش و جذبہ کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ عوام اور نوجوان اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کریں اور ہندوستان کی تاریخ بدل لیں۔

محترمہ قمر جمالی نے سورج پور کی سماجی زندگی کو حقیقت سے اس قدر قریب کر دیا ہے جسے پڑھ کر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ ہندوستان کے جدید دیہی نظام میں بھی قدیم دیہی زندگی سانسیں لے رہی ہیں۔ صورتیں اگرچہ کے بدلی ہوئی ہیں مگر حقائق وہی ہیں۔

ایک طرف جہاں ناول میں گاؤں کی سماجی وسیاسی زندگی ملتی ہے وہیں خوبصورت مناظر اور ہندوستانی دیہات کی خوبصورتی بھی اس ناول میں چار چاند لگاتی ہے۔ صبح کے اوقات میں گاؤں کا ایک خوبصورت منظر ملاحظہ ہو:

> ''میں ابھی ابھی صبح کی عبادت سے فارغ ہو کر باہر نکلا تھا۔ محکمہ والوں نے میری چائے کا انتظام باہر ورانڈے میں کر رکھا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سامنے نہر میں مرغابی کے جوڑے پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے اور سورج کی شنگرفی کرنیں پھیل سکڑ کر عجیب رنگ برنگی دائرے بنا رہی تھیں۔ جب بھی کوئی مرغابی ڈبکی لگا کر سر اوپر اٹھاتی، قوس و قزح کا ایک دائرہ اپنے اطراف کس لیتی تھی''

(قمر جمالی، ناول آتش دان، ص 56)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''شام پیڑوں پر اُتر چکی تھی
> چڑیوں کی چہچہاہٹ میں سریلا پن بڑھ گیا تھا۔ آسمان بھی سر پر نیلی، گلابی اور سرمئی ردائیں پھیلائے رحمتوں کے برسنے کا اشارہ کر رہا تھا۔
> میں صحن میں آرام کرسی میں دھنسا گودھول کا نظارہ کر رہا تھا اور دل بری طرح میر مدار کا انتظار کر رہا تھا۔
> گودھول دبنے لگی تھی اور لیمپ پوسٹ کی مدھم زرد روشنی آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگی تھی۔ دور تک جانوروں کے ریوڑ، جھومتی گائیوں کے پچھلے حصہ پر دائیں بائیں جھولتی لمبی چوٹیوں کی طرح بل کھاتی دُمیں، اور پیچھے پیچھے بوجھ اور تھکے تھکے قدموں سے چلتے ان کے گلے بان۔۔۔سب کچھ

معدوم ہورہے تھے۔'' (قمر جمالی، ناول آتش دان، ص179)

مندرجہ بالا دو اقتباسات میں صبح و شام کے خوبصورت مناظر کچھ اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ قاری کے ذہن میں منظر نگاری کا خوبصورت عکس کسی فلمی تصویر کی طرح اُبھر آتا ہے۔ نماز فجر کے بعد کا منظر اندھیرے کے چھٹنے اور آسمان پر چھانے والے خوبصورت اُجالے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو نئی زندگی کی بشارت ہے۔ جبکہ دوسرا اقتباس شام کے اس منظر کو پیش کرتا ہے جس میں انسانی زندگی سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ تھمنے لگتی ہے، یہ نظام فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات اپنے بندوں کے آرام کے لیے عنایت کی ہے۔ گاؤں کے کسان اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں اور ان کے چلنے سے اٹھنے والی دھول میں شہباز خان سب کچھ دیکھ رہا ہے مگر یہ نظارہ دھول کے بڑھنے سے دھندلا ہورہا ہے۔ ناول نگار نے ان مناظر کے ذریعہ گاؤں کی ایک خوبصورت زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔

الغرض ''آتش دان'' میں سلگتی، جلتی، بے چین و بے قرار دیہی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں عوام صرف اور صرف ایک شخص کی مطلق العنانیت میں آنکھیں موند کر، چپ چاپ اپنی زندگی کو قسمت کے حوالے کرتے ہوئے کانٹوں بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ مگر جس دن انھیں اپنے ووٹ کی طاقت کا اندازہ ہوا ہے، انھوں نے اپنی زندگی بدلی، یہ طاقت جمہوری ہندوستان نے انھیں دی ہے۔ یہ ناول غافل عوام کو جھنجھوڑتا ہے جو اپنے ووٹ کے استعمال سے ناواقف ہی نہیں بے خبر بھی ہیں۔

□□□

Dr Abdul Mogni Siddiqi
H.No 19-2-239/15/16
Chandulal Baradari
Hyderabad-500064 (Telangana)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکن/ سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی

نصرت مہدی کی شعری کائنات

اردو شاعری بڑی سخت جاں ہے۔اس نے کبھی میکدے کی دراڑوں سے اندر جھانکا اور ساغر و مینا کی کھڑ کھڑاہٹ سنی۔کبھی چمبیلی کے منڈوے تلے آئی اور دو سلگتے جسموں کو راکھ بنتے دیکھا۔محبت کی تربت پر دو بوند آنسو ٹپکائے اور ویران کھنڈروں میں یادوں کے دیپ روشن کیے تو کبھی تلواروں کی جھنکار بھی سنی۔کربلا کے تپتے ریگ زاروں میں معصوم شہیدوں کی تڑپتی لاشوں کو بھی دیکھا۔فرات پر ظالموں کے پہرے کو بھی دیکھا۔ہجر اور ہجرت دونوں کی تلخیوں سے بھی اس کا سابقہ پڑا۔نیز ذات کو اپنی ذات سے اجنبی ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔وہی اردو شاعری صدیوں کی مسافت کے بعد نصرت مہدی کے در پر آئی ہے جہاں محسوسات کی آنچ تیز ہے۔بقول علی احمد فاطمی:

"اردو کی نئی غزل میں اکثر و بیشتر اپنی ذات کی فکر، اپنے وجود اور اس کے بقا و فنا کے سلسلے کہیں فطری کہیں منطقی اور کہیں فلسفیانہ انداز میں بکھرے ہوئے ہیں کہیں کہیں یہ خیال اپنی ذات کے اندرون میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیتا ہے اور کہیں کہیں احباب کے دھوکے، انسانیت کے فریب، اپنوں کی بے گانگی غرض کہ انسانی رشتوں کی شکستہ حالی اور اس کے اردگرد شاعر کو پہنچا دیتی ہے۔"

("نئی صدی میں غزل کے امکانات"، دربھنگہ ٹائمز ص 37)

جب تک تخلیق کاروں کی تخلیقات کا منتھن نہیں ہوگا امرت باہر نہیں نکلے گا۔نصرت مہدی کی تخلیق کے ساگر منتھن کے دوران اس کا احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ موصوفہ اس نسائیت کی علمبردار بن کر سامنے آئیں ہیں جس کو اس مرد اساس معاشرے میں دوسرے درجے کی چیز سمجھ کر ہیچ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔موصوفہ اپنی فکر کی توانائی سے اس کے وجود کو منوانا اور اس کے ماتھے پر لگے ناقص العقل کے کلنک کو مٹا دینا چاہتی ہیں لیکن لہجہ میں تراریت نہیں ہے۔نہ ہی باغیانہ تیور ہے۔بلکہ وہ بڑے ہی نرم مزاجی کے ساتھ سادگی سے بات کہہ جاتی ہیں جو سیدھے دل میں پیوست ہوتی ہے۔

میں زندگی کی کتاب میں ایک فسانہ بے اثر نہیں تھی
ورق کو جلد ہی الٹ گئے تم، میں قصہ مختصر نہیں تھی

لوگ سمجھے ہی نہیں میرے ہنر کو ورنہ
مجھ میں فن کار تھا پوشیدہ میں فن کار میں تھی

نصرت مہدی نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے نسائی جذبات واحساسات کو سپرد قلم کیا ہے جس میں شوخی، سنجیدگی دکھائی دیتی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے دامن میں معاشرے کی تلخی، ترشی، انتشار واحتجاج کو سمیٹا ہے ان کی شاعری کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ روح کے

کرب کا اظہار جذبات کی رو میں بہے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں نسائیت انانیت کا شکار نہیں ہے لیکن تذبذب کے حصار میں ضرور مقید ہے۔

میں کیا کروں کہ تیری انا کو سکوں ملے
گر جاؤں ٹوٹ جاؤں بکھر جاؤں کیا کروں

کیا حکم آپ کا ہے مرے واسطے حضور
جاری سفر رکھوں کہ ٹھہر جاؤں کیا کروں

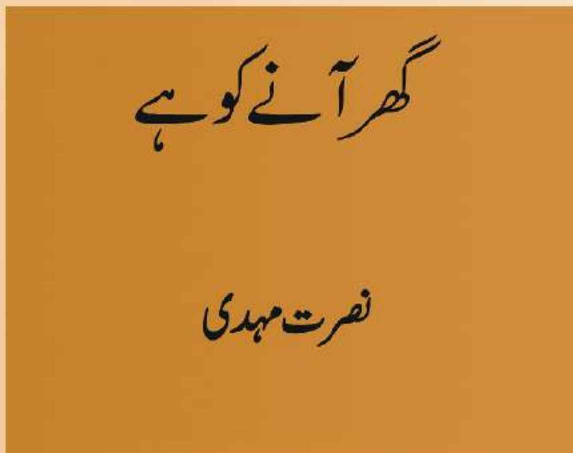

انسان زبان اور لہجے کے پردے میں چھپا ہوتا ہے۔اس کو جب ہم میزان بناتے ہیں تو موصوفہ کے لہجے میں مشرقیت کی خوشبو ہے جو اپنے ورثے سے مربوط رہنے کی وجہ سے ان کے کلام میں پیہم ہے۔تخلیق کے آئینے میں تخلیق کار کی شخصیت،اس کی فکر،اس کی نکتہ نگاہ،اس کی انسان دوستی،معاشرے کے دیگر مسائل پر اس کے خیال گویا کہ اس کی شخصیت کی پوری کائنات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے نیز کسی موضوع یا مسائل پر اس کی منفی و مثبت سوچ کی قدر پیمائی بھی ممکن ہے۔نصرت مہدی نے اپنی شاعری کے کینوس پر جس پیکر کو تراشا ہے اس کے اندر کا موسم سبزہ زار ہے۔اس موسم میں خواہشوں کے شجر پر خوب خوب برگ وبار آئے جن سے زندگی کا گلشن معطر رہا۔پرندے اس شاخ سے اس شاخ پر پھدکتے رہے۔ستارے چمکتے رہے۔ماہتاب چاندنی بکھیرتا رہا۔شبنم کی پھوار گرتی رہی ہے۔یادوں کا صندل مہکتا رہا۔خوابوں کی جھیل میں نرم نرم موج اٹھتی رہی،اُفقِ زندگی پر جل ترنگ بجتے رہے کہ ایک دن مقدر کا ستارہ شہاب ثاقب بن گیا۔

جس سمت بھی دیکھوں میں سرابوں کی صلیبیں
پھیلا ہے عجب ریت کا صحرا مرے آگے

ناکردہ گناہوں کی سزا پائی ہے نصرت
انصاف ہوا شہر میں رسوا مرے آگے

عمومی ایسا مزاج بنا ہے کہ نئی غزل میں مزاحمتی لہجہ،احتجاجی لہجہ کی سردمہری ہے۔بس حالات کی مرثیہ خوانی اور ثناء خوانی کی لیے تیز ہے۔لیکن نصرت کے یہاں اس مزاج کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔نصرت مہدی کے کلام میں لفظ کی حرمت بحال رہتی ہے اور جب لفظ قاری سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو فن پارہ لازوال ہوجاتا ہے اور اس کی معراجیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوجاتا ہے۔ایسا اس لیے کہ ہر لفظ کی اپنی ایک Potency ہوتی ہے۔اپنی ایک توانائی ہوتی ہے۔اور جب کوئی شاعر شعر کہنے کے دوران لفظوں کی Potency تجویز کرنے کے ہنر سے آشنا ہوتا ہے تو اس کی نوک قلم سے نکلا ہوا فن پارہ سیدھے قاری کے جگر کو پار کرتا ہے اور اعصاب پر اپنی توانائی کا اثر چھوڑ جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نصرت مہدی کا کلام پڑھ اور سن کر اس حقیقت کا راز افشاں ہوتا ہے کہ دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے۔!

حق پرستوں کی جہاں رائے شماری ہوگی
سب سے پہلے وہاں آواز ہماری ہوگی

تول کر دیکھ لے عظمت کے ترازو میں اسے
میری چادر تری دستار سے بھاری ہوگی

میں پیاس کی شدت کا فلک چوم رہی تھی
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

موج نے ریت پہ ساحل کی لکھا شرمندہ
تشنگی میری نے دریا کو کیا شرمندہ

جب تک ذات کے اندر کی سیاحی مکمل نہیں ہوتی قلم سے ایسے فن

پارے کا نزول نہیں ہوتا جو قاری پر اپنا طلسمی اثر دکھائے یا ان کے مسائل کا تریاق بن جائے۔ ساتھ ہی ساتھ جب تک اسلوب میں جدّت نہیں آتی انفرادیت کے نقوش واضح نہیں ہوتے۔ ہوا جب چراغوں کی آبرو بچاتی ہے تو اس کے وجود پر انگلی اٹھنے لگتی ہے۔ اس لیے قرطاس ادب پر مہدی ایسی عورت کا ترجمان بن کر سامنے آتی ہیں جو حالات کی ستمگری سے خوف کے گرداب میں ہے لیکن نامساعد حالات میں بھی حوصلے کا بادباں بے ہوا ہونے نہیں دیتی ہیں بلکہ استفہامی لب ولہجہ میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہیں۔

پھر آ کے لگ رہے ہیں پروں پر ہوا کے تیر
پرواز اپنی روک لوں ڈر جاؤں کیا کروں

جنگل میں بے اماں سی بیٹھی ہوئی ہوں میں
آواز کس کو دوں میں کدھر جاؤں کیا کروں

جب ذاتی واردات فن کا لبادہ زیب تن کرتی ہے اور اس میں اجتماعیت کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں تو اس کی آفاقیت کا سب سے اونچا میزان قائم ہوتا ہے۔ دریں اثنا جب تحریر میں زندگی کا ملال بولنے لگتا ہے اس وقت قاری پر مایوسی کے سائے دراز ہوتے ہیں۔ نصرت مہدی کا جو بھی کلام اب تک مجھے دستیاب ہوا اس میں کمال کی نغمگی ہے لیکن ملال کا شجر کم شاداب نظر آیا۔ اس لیے اس کی گہری پرچھائیں کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہاں نسائی حوصلے کا فریرا دور سے لہراتے نظر آئے۔ نیکی کی خوشبو کی تقسیم کاری کے منظر بھی آنکھوں کے سامنے آئے اور فن پارے کی گود میں حال، ماضی اور مستقبل کو ہمکتے بھی دیکھا اور ایسے اشعار سے بھی سابقہ پڑا جہاں نسائیت کی خودداری اپنے وجود کو منوانے پر کمربستہ ہے۔

آپ شاید بھول بیٹھے ہیں یہاں میں بھی تو ہوں
اس زمین وآسماں کے درمیاں میں بھی تو ہوں

حیثیت کچھ بھی نہیں ہے بس ایک تنکے کی طرح
فکر وفن کے اس سمندر میں، میں بھی تو ہوں

نئے ملاح طوفاں سے ہمیں ہشیار کرتے ہیں
انہیں معلوم کیا ہاتھوں کو ہم پتوار کرتے ہیں

اوڑھ کر دھوپ کی گھنی چادر
اپنی ہستی پر سائباں ہوجاؤں

روایتی موضوعات سے دامن کش ہو کر نئے نئے موضوعات جب وجدان کا حصہ بنتے ہیں تب ادب کے دامن میں نہ صرف وسعت آتی ہے بلکہ موضوعات کی نیرنگیاں قاری کو اپنا جلوہ دکھاتی ہیں نتیجتاً ادب تازہ دم ہونے لگتا ہے۔ یہ تازہ دمی اس قلم کار کے سر پر مقبولیت اور قبولیت کا تاج رکھتی ہے۔ بیشک یہ کام تھوڑا مشکل ضرور ہے لیکن اس عمل کے دوران فنی شعور میں جب احساس کا رمز اور فکر کی رعنائی اپنا چولا بدلتی ہے تو ادب میں ایک نئی فضا سازگار ہوتی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ خارجی اور باطنی حقائق کو پیش کرنا ادب عالیہ کا وطیرہ رہا ہے۔ زندگی کا تجربہ جب شعر کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو ایسے شعر کی مقبولیت بڑھتی ہے کہ قاری ادب کے آئینے میں زندگی کا عکس دیکھنا چاہتا ہے۔

زندگی ہے مری ٹھہرا ہوا پانی جیسے
ایک کنکر سے بھی ہوجاتی ہے ہلچل مجھ میں

آج بھی ہے تیری آنکھوں میں تپش صحرا کی
کروٹیں لیتا ہے اب بھی کوئی بادل مجھ میں

باغِ محبت میں قاصد حسن سے عشق کا خراج تب مانگتا ہے جب بارگاہ محبت کی آبرو بچانی ہوتی ہے اس لیے نصرت مہدی کے یہاں زندگی کے رحل پر سورہ عشق کی تلاوت کے دوران جب جب ہجر کی آیت آئی محبوبہ فوراً ورق الٹ دیتی ہے کیونکہ اس عذاب دید موسم میں آنکھیں لہولہان ہوجاتی ہیں اور محبت کے ملبے پر بیٹھے کسی کے رونے کی آواز آنے لگتی ہے۔ پروین شاکر اور نصرت مہدی کے تراشیدہ نسائی پیکر میں ایک مماثلت ہے وہ یہ کہ دونوں کے نسائی شعری پیکر اپنے محبوب کے لیے بددعا نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے لیے بے رخی یا تلخ کلامی کے لہجے کا سہارا لیتے ہیں۔ بلکہ بہت ہی مشفقانہ رویہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔

خواہشیں آ کے لپٹ جاتی ہے سانپوں کی طرح
جب مہکتا ہے تیرے یاد کا صندل مجھ میں

روٹھنا کیا ہے چلو میں ہی منا لاؤں اسے
بے رخی سے اس کی نصرت میں بھی تو ہوں

حسن کا ادراک فن کی کسوٹی ہوتی ہے۔ اگر اس میزان پر مہدی کے کلام کو پرکھا جائے تو اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کلام عروض کی پابندیاں کرتے ہیں۔ شاعری کے لیے قرطاس ادب پر عروض دانوں نے جس لکشمن ریکھا کو کھینچا ہے اس کو عبور کرنے کی جراءت نصرت مہدی نہیں

کرتی ہیں ایسا اس لیے کہ اس سے سیتا ہرن کا اندیشہ غالب رہتا ہے۔ عصری مسائل کے بطن سے پنپی اداسیاں، تاریک ہوتی مستقبل کی فکر، مذہبی اور سماجی چیلینج کے بطن سے پھیلے خوف وہراس کا ماحول، انسانوں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں جو آدمی کو صوفی ازم کے قریب کرتا ہے۔نصرت مہدی کے یہاں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بظاہر ان اشعار سے عشق مجازی کی کرنیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔

ندامتوں کا رنگ جس کی عاجزی میں آگیا
وہ تیرگی سے چل کے جیسے روشنی میں آگیا
جب اس کا کوئی داو مجھ پر کارگر نہ ہوسکا
تو یہ ہوا کہ وہ میری سپردگی میں آگیا

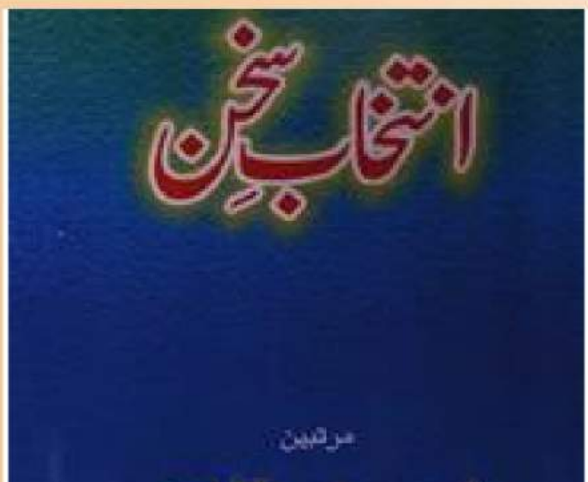

خواتین نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔نصرت مہدی کا شمار اسی صف میں ہوتا ہے۔ان کے یہاں ہولناک صحرا میں کارواں کی یاد آتی ہے، دل کی زمین پر اداسیاں خیمے لگائے بیٹھی رہتی ہیں، جس کے سبب خوشی کا پڑاؤ مشکل ہے، معشوقہ زندگی کی بجائے عادتاً محبوب کی آوارگی میں شامل ہے، ادب میں بھی رزق حلال کی تلاش رہتی ہے، جب بلندیوں پر توازن قائم نہیں رہتا اس وقت عروج کو زوال کی خواہش ہوتی ہے۔نسائیت آزمائش کے اس موڑ پر ہے جہاں وہ آگ میں کھڑی ہے لیکن بدن جل نہیں رہا ہے۔زندگی کے سفر میں سب ایک ساتھ ہیں لیکن کوئی کسی کے ساتھ چل نہیں رہا ہے۔حرارت کی تمازت نکتہ راس پر ہے لیکن درمیان میں کھڑے برف کے پہاڑ کا نکتہ انجماد کم نہیں ہورہا ہے۔ایسے میں ان کی شاعری کے قرطاس پر شادی شدہ عورتوں کے احساسات و جذبات کے اظہار کا طریقہ بڑا دلنواز ہوتا ہے۔

دھوپ نے ستایا تو سائباں کی یاد آئی
ہر گھڑی بزرگوں کے آستاں کی یاد آئی
جو ہمیں دم رخصت تک رہا تھا حسرت سے
غم زدہ تن و تنہا اس مکاں کی یاد آئی

شاعری کے علاوہ موصوفہ افسانے، ڈرامے، مضامین کے علاوہ اسکرپٹ بھی لکھتی ہیں۔ایک لمبی مدت تک مدھیہ پردیس اردو اکاڈمی کی سکریٹری رہیں اور انتظامی امور کو حسن وخوبی سے سنبھالا اور اس کے وقار میں اضافہ کیا۔اس کے علاوہ ڈپٹی ڈائریکٹر علامہ اقبال ادبی مرکز محکمہ ثقافت مدھیہ پردیس، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے Executive بورڈ کی ممبر، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کی مجلس مشاورت کی ممبر، سی سی آرٹی وزارت ثقافت دہلی کے اردو پینل کی ممبر، مدھیہ پردیش کے چیف Executive آفیسر مدھیہ پردیش وقف بورڈ اور مدھیہ پردیس اسٹیٹ حج کمیٹی میں Executive آفیسر رہیں۔فی الحال موصوفہ بھوپال اردو اکاڈمی، مدھیہ پردیس کی فعال سکریٹری ہیں۔ان کی زبان میں شیرنی، گھلاوٹ اور ترنم میں بلا کی سحر انگیزی ہے۔"سایہ سایہ دھوپ"، "آبلہ پا"، "میں بھی تو ہوں"، "گھر آنے کو ہے"، "حصار ذات سے پرے"، "فرہاد نہیں ہونے کے" موصوفہ کے شعری مجموعے ہیں۔نثر میں بھی ان کی دو کتابیں "1857 کی جنگ آزادی" اور "انتخاب سخن" اشاعت کے مرحلے سے گذری ہیں۔اب تک امریکہ، انگلینڈ، دبئی، سعودی عرب، پاکستان، بحرین، قطر، کویت، مسقط وغیرہ ممالک کے ادبی اسفار پروین شاکر کے اس قول پر تصدیق کی مہر ثبت کرتی ہیں کہ:

"شہرت اپنی روح کی کمائی ہوتی ہے کسی نام کی زکوۃ نہیں۔!!"

□□□

Azimullah Hashmi
HNO:1/A,BL.NO:23,KELA
BAGAN,JAGATDAL,NORTH 24
PARGANAS,W.B,PIN:743125

ڈاکٹر شعیب انصاری

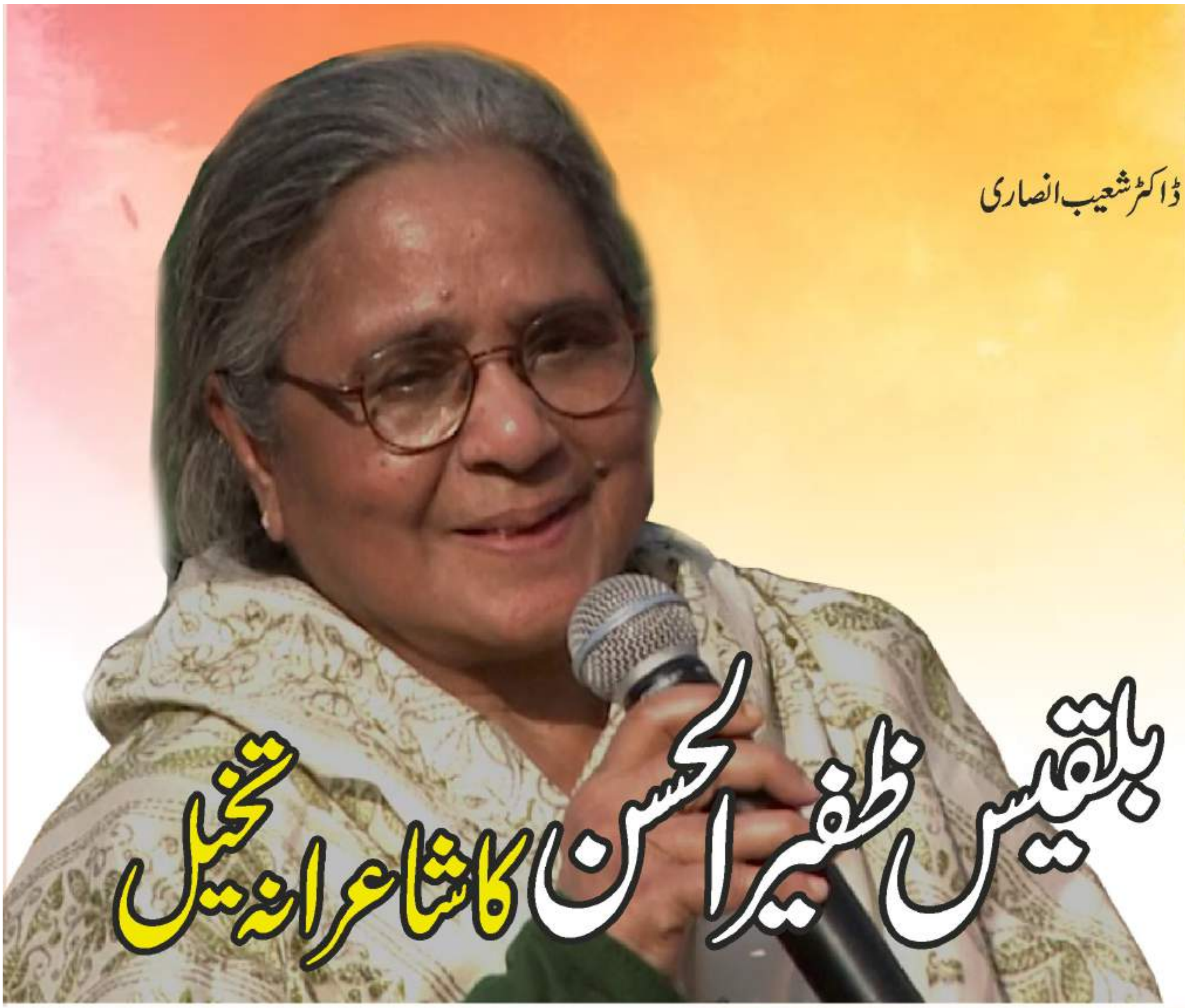

بلقیس ظفیر الحسن کا شاعرانہ تخیل

بلقیس ظفیر الحسن کا اصل نام بلقیس پروین ہے۔ پیدائش 1 دسمبر 1938 کو صوبہ بہار کے موتی ہاری ضلع میں ہوئی۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی کیونکہ ان کے والد عنایت اللہ الرحمٰن عنایت خود بھی ایک خوش فکر شاعر تھے۔ تعلیمی طور پر بلقیس کے پاس کوئی سند نہیں جو کچھ تعلیم و تربیت ہوئی گھر پر ہی ہوئی۔ انھوں نے شاعری، افسانے اور ڈرامے تینوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہوا لیکن والدین کے مشوروں سے بعد میں وہ افسانے کی طرف مائل ہوگئیں۔ ابتداء میں وہ بلقیس رحمانی کے نام سے کہانیاں لکھتی رہیں۔ ان کی شادی سید ظفیر الحسن سے ہوئی۔ ان کے ڈرامے اور کہانیاں برصغیر کے موقر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ گھریلو مصروفیات کی بنیاد پر وہ افسانہ نگاری کے میدان میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائیں۔

بلقیس صاحبہ نے سنجیدہ شاعری کے علاوہ بچوں کے لیے بھی خوبصورت نظمیں لکھیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''گیلا ایندھن'' 1996 میں دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''شعلوں کے درمیان'' 2004 میں۔ افسانوی مجموعہ ''ویرانے آباد گھروں کے'' 2008 کہانیوں اور نظموں کا مشترکہ مجموعہ ''دلچسپ'' کے نام سے شائع ہوا۔ ڈرامے ''تماشا کرے کوئی'' کے نام سے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت ساری نظموں کے انگریزی اور ہندی ترجمے بھی مختلف انتخابات میں شامل ہیں۔

جہاں تک شاعری کا معاملہ ہے تو انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کی غزلوں کا تیور بے حد متاثر کن ہے وہ نہ صرف یہ کہ غزل کے فنّی تقاضوں کی ایک رمز آشنا شاعرہ ہیں بلکہ ان کی غزلوں کا نیا پن دور سے ہی ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ان کی ایک غزل سے یہ دو اشعار ملاحظہ کریں:

بے سمت اڑانوں سے پشیمان پرندہ
اب اپنی ہی منقار سے پر کاٹ رہا ہے

اک ضرب مسلسل ہے کہ رکتی ہی نہیں ہے
ہر تار نفس درد جگر کاٹ رہا ہے

مذکورہ دونوں اشعار غزل کی تہذیب سے آشنائی کا عمدہ نمونہ ہیں۔اس قدر کسا ہوا حشو وزواید سے پاک مطلع اور بے ساختہ شعر بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔کیا روانی ہے، کیا سادگی ہے اور عجز سے پاک بھرپور طرز اظہار ہے جو غزل آشنا ذہن کو نہ صرف متوجہ کرتا ہے بلکہ ایک مثبت قسم کی رقابت میں مبتلا کر دیتا ہے کہ کاش یہ اشعار ہم نے کہے ہوتے۔ پہلے شعر میں بے سمت اڑانوں سے پشیمان پرندے کو اپنی ہی منقار سے پر کاٹتے ہوئے دکھایا گیا ہے دوسرے شعر میں ہر ایک سانس کو ضرب مسلسل سے جگر کاٹتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔دونوں اشعار، استادانہ رنگ کے ہیں۔ جو تلازمات کی فضا سازی بھی کرتے ہیں اور معلوم روایات کی توسیع بھی۔میرے خیال میں بلقیس صاحبہ کی غزلوں کا استادانہ رنگ ہی ان کا طرہ امتیاز ہے۔محاکات، پیکر، تلازماتی فضا، معنوی توسیع، روایت سے گہری آشنائی، بے ساختہ طرز اظہار ان کی شاعری کے ایسے اوصاف ہیں جو ان کی غزلوں میں بکھرے پڑے ہیں۔اوپر میں نے ان کی ایک غزل کے دو اشعار کے حوالے سے بساط بھر ان کی فنی انفرادیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے اسی تناظر میں ان کی دو مکمل غزلیں اور کچھ منتخب اشعار ملاحظہ کریں۔

دیتا تھا جو سایا وہ شجر کاٹ رہا ہے
خود اپنے تحفظ کی وہ جڑ کاٹ رہا ہے

بے سمت اڑانوں سے پشیمان پرندہ
اب اپنی ہی منقار سے پر کاٹ رہا ہے

محبوس ہوں غاروں میں مگر آذر تخئیل
چٹانوں میں اشکال ہنر کاٹ رہا ہے

ہے کون کمیں گاہ میں یہ کیسے بتاؤں
ہر تیر مگر میرے ہی پر کاٹ رہا ہے

امید اجالے کا لیے تیشہ ہر اک دل
ہر رات بہ انداز سحر کاٹ رہا ہے

کرتا ہے فزوں وحشت دل دشت کا موسم
بلقیس مگر کیا کروں گھر کاٹ رہا ہے

....

مٹی کی کمائی ہوں لٹا کیوں نہیں دیتے
ہوں خاک تو مٹھی سے گرا کیوں نہیں دیتے

اک سرد اندھیرے کے سوا کچھ نہیں ملتا
اس گھر کو کہو آگ لگا کیوں نہیں دیتے

قسطوں میں مرا قتل ہو ہے کیا یہ ضروری
اک بار ہی سب زہر پلا کیوں نہیں دیتے
کہتے ہو کبھی 'یوں' کبھی 'ووں' سچ نہیں کہتے
کیا بات ہے آخر یہ بتا کیوں نہیں دیتے

ہم خود کے بھی بلقیس کہاں ہاتھ لگے ہیں
کیا چیز تھی جاں تم کو بھلا کیوں نہیں دیتے

......

مذکورہ دونوں غزلوں اور اشعار کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان میں غزل کا رچا ہوا شعور ہے جو بلوغت آشنا اور تکمیلت کے احساس سے لبریز ہے۔اچھی غزلیں کہنا کوئی کمال کی بات نہیں لیکن منفرد غزلیں کہنا بڑے کمال کی بات ہوتی ہے۔جس کی مثالیں ہمیں بلقیس صاحبہ کی غزلوں میں جابجا مل جاتی ہیں۔ان کی نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلیں زیادہ متوجہ کرتی ہیں ان کی غزلوں کے بارے میں ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے لکھا ہے:

''غزل کے لہجے کی وہ مخصوص نزاکت جو کبھی لفظوں کے محتاط استعمال سے آتی ہے اور کبھی اس شعریت کی مرہون منت ہوتی ہے جس کے بغیر غزل کی ہیئت میں لکھے جانے کے باوجود خیال شعر نہیں بن پاتا ان کی غزل میں نمایاں ہے بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہو کہ مضامین کی بوسیدگی کے باوجود نظم سے زیادہ غزل میں کامیاب ہیں۔''

(آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، 2017، ص-180)

نجمہ رحمانی صاحبہ نے بلقیس صاحبہ کے حوالے سے غزل کے لہجے کی جس مخصوص نزاکت کا ذکر کیا ہے وہ واقعی قابل صاد ہے۔

جہاں تک بلقیس صاحبہ کی نظموں کا تعلق ہے تو ان کی دو نمائندہ نظمیں ''خربوزہ اور چھری'' اور ''ہوا کی مجھ سے کیسی دشمنی ہے'' ملاحظہ کریں۔

خربوزہ ___ اور چھری

چھری خربوزے پر گرے، یا خربوزہ چھری پر

چھری کا کبھی کچھ نہیں بگڑتا
جو کٹ جاتا ہے، وہ خربوزہ ہوتا ہے
چھری پہلے کی طرح تیز اور چمک دار
دوسرے خربوزے کو چیرنے کو تیار!
گلی سے گزرتے ہوئے غنڈے نے
سیٹی ماری تھی اس پر
سیتا اب گھر سے باہر نہیں نکلتی ___ منا ہی ہے!
پڑوسی کی تاک جھانک پر ___ بھابھی کو میکے پہنچا آئے بھیا
ریپ کیے جانے پر
ساوتری خودکشی کر کے مر گئی
ہاں!۔ چھری خربوزے پر گرے، یا خربوزہ چھری پر
کٹنا تو خربوزے کو ہی ہوگا
مگر ___ کیا ___
عورت اور خربوزے میں کوئی فرق نہیں؟

ہوا کی مجھ سے کیسی دشمنی ہے

ہوا کی مجھ سے کیسی دشمنی ہے؟
جتن سے اپنا آنگن صاف کرتی ہوں
اٹھا کے خشک پتے نیم کے
جھڑ جھڑ کے جو شاخوں سے بکھرے تھے
کنارے کر کے رکھتی ہوں خس و کاشاک
چنتی ہوں
پتے تندور سے آنگن کی جلتی دھول پر
پانی کے چھینٹے ڈالتی ہوں
تپش ان کی بجھاتی ہوں،
مرا آنگن سلونی سوندھی کوری خوشبوؤں میں
ڈوب جاتا ہے
مہک اٹھتا ہے لپٹیں دینے لگتا ہے
نہایت مطمئن ہو کر کشیدہ کاریاں لے کر میں اپنی
بیٹھ جاتی ہوں
تبھی! کسی سمت سے آتی ہے۔ کتنے زور سے آتی ہے
بھر دیتی ہے آنگن میں مرے پھر سے
وہ خار و خس، وہی سوکھے ہوئے پتے
کشیدہ کاریوں پر میری مٹی ڈال دیتی ہے!
ہوا مجھ سے خفا کیوں ہے؟

پہلی نظم ”خربوزہ اور چھری“ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ مرد اور عورت کے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ مرد خربوزہ ہے اور عورت چھری۔ اب اگر خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر نقصان خربوزے کا ہی ہونا ہے چھری کا نہیں۔

دوسری نظم ”ہوا کو مجھ سے دشمنی ہے“ بھی نسائی جذبوں کے کھلنے کے خیال پر مبنی ہے گرچہ بلقیس صاحبہ نے اس نظم کی زبان میں وہ شائستگی رکھی ہے کہ ”برہنہ حرف نہ گفتین کمال گویائی“ والا معاملہ نظر آتا ہے۔ وہ متعدد حوالوں سے ہوا کی دشمنی کو اجاگر کرتی ہیں۔ یہ نظم ظلم و ناانصافی کا استعارہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ میں آنگن صاف کرتی ہوں۔ نیم کے پتوں کو ڈھیر لگا کر جمع کرتی ہوں لیکن ہوا اسے پھر بکھیر دیتی ہے۔ میں اپنی کشیدہ کاری لے کر بیٹھتی ہوں تب بھی ہوا پریشان کرتی ہے اور آخری مصرع ہوا مجھ سے خفا کیوں ہے؟“ کے ساتھ یہ نظم مکمل ہو جاتی ہے۔

بلقیس صاحبہ کی ایک اور نمائندہ نظم ”وھیل چیئر میں بیٹھی زندگی“ ملاحظہ کریں:

وھیل چیئر میں بیٹھی زندگی

نہیں کہ تم جہاں چل رہے ہو وہاں کی زمین
قدم قدم پر پھٹتی نہیں۔
نہیں کہ آسمان تمھارے سر پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا نہیں
نہیں کہ راستے کی گرد ___ تسمہ پا بن کر
تمھارا گلا نہیں گھونٹتی
نہیں کہ تم جس طرح جینا چاہتے ہو۔ جی سکتے ہو
لیکن تم --- کوشش تو کر سکتے ہو
کوشش۔! جو میرے لیے ممنوع قرار دے دی گئی
اب میرے سر پر آسمان ٹوٹے
یا پیروں تلے پھٹ جائے زمین
میں تو بھاگ بھی نہیں سکتی
پیدا ہوتے ہی
میرے پیروں میں ڈال دیے گئے تھے
لوہے کے جوتے!

ان بغیر بڑھے پیروں سے
نزاکت سے پھدک پھدک کر
کمرے سے آنگن تک کا راستہ ہی طے کیا جا سکتا ہے
بھاگنے دوڑنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا
اپنی زندگی کے وھیل چیئر پر بیٹھی میں
ہر آنند وردھن کو دیکھتی ___ انتظار کرتی رہتی ہوں
اس کا ___ جو آئے ___ اور میری وھیل چیئر دھکیل کر
مجھے گلیوں سڑکوں پر لے جائے،
اپنے سہارے، مجھے میرا شہر دکھائے
برف کی طرح ٹھنڈے اسٹیل نے ___ مجھے کاٹ کھایا ہے
میرے بیٹھنے کی جگہوں پر، زخم تو پہلے ہی پڑ چکے تھے
اب بری طرح سڑ رہے ہیں
مگر میں اور کروں بھی تو کیا
ان بے بڑھے پیروں کو گھورنے کے سوا
ٹھیک کہتے ہو ___ بھلا میرا تمھارا کیا مقابلہ!

اس نظم میں بلقیس صاحبہ نے زندگی کی بے کسی کی تصویر کشی کی ہے۔جیسا کہ ظاہر ہے کہ وھیل چیر پر بیٹھی زندگی مفلوج ہی ہوگی اس میں فعالیت کی تلاش عبث ہے۔وہ کہتی ہیں میں اپنی زندگی کی وھیل چیر پر بیٹھی کسی کے انتظار میں ہوں کہ وہ آئے اور مجھے گلی شہر دکھلائے۔آگے کہتی ہیں میرے بیٹھنے کی جگہوں پر، زخم تو پہلے پڑ چکے تھے۔اب بری طرح سڑ رہے ہیں یہاں بیٹھنے کی جگہوں کے ٹکڑے میں زبان کی جو شائستگی ہے وہ قابل غور ہے۔یہ نظم عورت کی مفلوج زندگی کا استعارہ بن گئی ہے۔اس نظم میں کہیں کڑوے کسیلے خیالات ہیں تو کہیں تہہ نشیں طنزیہ اظہار۔

بحیثیت مجموعی یہ ایک پرتاثیر نظم ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ بلقیس کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے ارجمند آرا نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> ”بلقیس ظفیر الحسن کے ہاں متعدد نظمیں ایسی ہیں جن میں ناانصافیوں کی جانب متوجہ کرنے کا پیغام براہ راست ملتا ہے ۔ان کا طنزیہ لہجہ نظم کو موثر بناتا ہے۔نظمیں خربوزہ اور چھری ،زمین کی بے وفائی، ہاؤس وائف اور سمان اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔“

(تانیثی مطالعات، ارجمند آرا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2015، ص 64)

ارجمند آرا نے ان کی نظموں کے طنزیہ لہجے کو ان کی نظم کی مرکزی خوبی تصور کیا ہے جو واقعی درست ہے ۔لیکن جب ہم ان کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی نظمیہ شاعری کے مقابلے میں ان کی غزلیہ شاعری ہمیں زیادہ متاثر کرتی ہے۔

Dr. Shoaib Ansari
Dept. of Urdu
Kartik Oraon College
Simdega Road, Pugu
Gumla-835207 (Jharkhand)

ڈاکٹر کہکشاں عرفان

غضنفر علی کی ناول نگاری

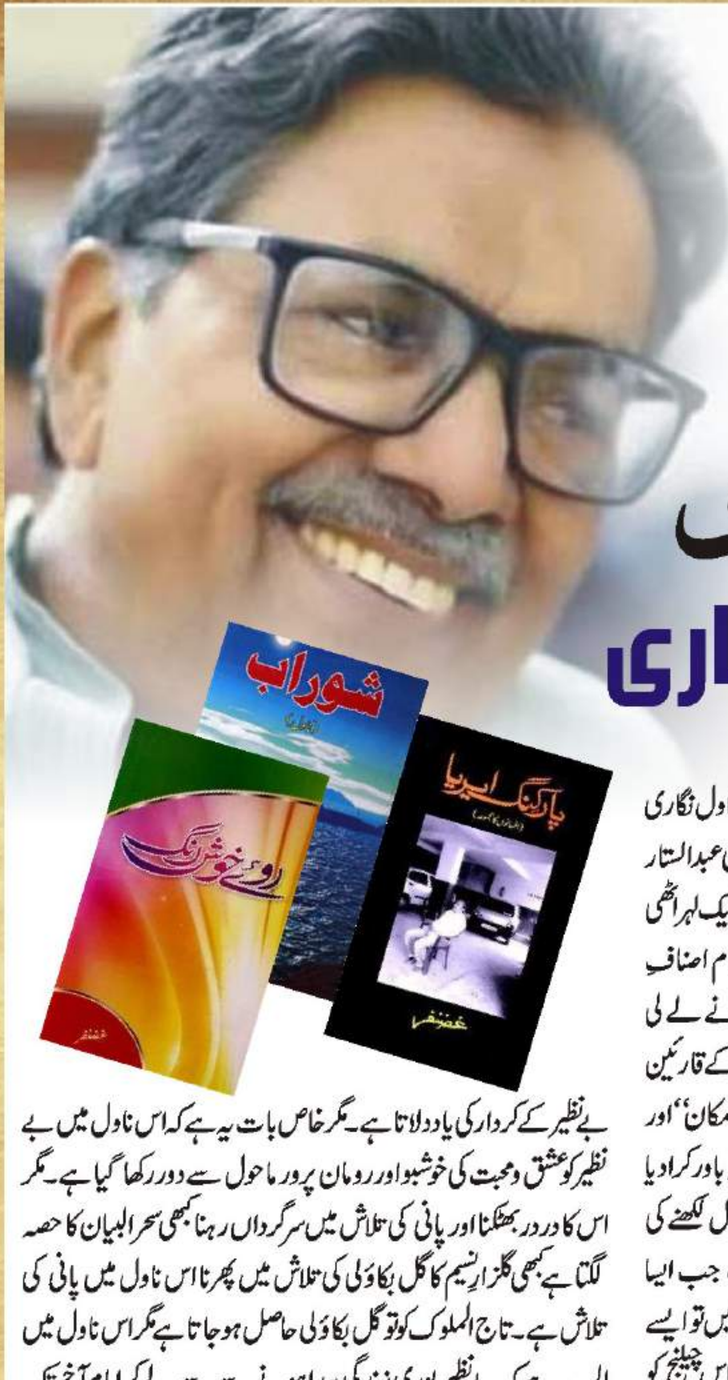

ترقی پسند فکر اور تحریک دونوں کی رفتار جب تھمنے لگی اور ناول نگاری کی تخلیقیت جوگیندر پال، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، اور قاضی عبدالستار تک آکر ٹھہر سی گئی تو پھر اردو ادب کے سمندر میں جدیدیت کی ایک لہر اٹھی جس کے روح رواں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ہیں، اور تمام اصناف ادب میں ترقی پسندی کی فکر کے بجائے جدیدیت کے طرز فکر نے لے لی اور 1980 کے بعد جدید ناول نگاروں کی ایک ٹولی اردو ادب کے قارئین کے سامنے آئی، عبدالصمد نے ''دوگز زمین'' پیغام آفاقی نے ''مکان'' اور غضنفر صاحب نے پانی اور کینچلی جیسے علامتی ناول پیش کر کے یہ باور کرادیا کہ اردو زبان و ادب میں اب بھی فکشن اور خصوصی طور پر ناول لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ غضنفر صاحب زود نویس فکشن نگار ہیں، جب ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ ناول نگاری اب نئی نسل کے بس کی بات نہیں تو ایسے میں تین ناول نگاروں عبدالصمد، پیغام آفاقی اور غضنفر علی نے اس چیلنج کو قبول کیا اور غضنفر علی نے پانی جیسی بنیادی چیز کو ایسے علامتی انداز میں پیش کیا کہ جس پر مگرمچھ جیسی طاقتوں کا قبضہ ہے۔ انسان اور جانور چرند پرند سب اسی شیطانی طاقت کے ظلم اور جبر کی وجہ سے اپنی بنیادی ضرورت بھی پوری کرنے سے محروم ہیں۔ داستانوں اور داستانوی انداز اپنانے کے لیے بڑی محنت کی گئی ہے اور مثنوی کی طرح مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی کے مصداق تسلسل ہے جو پورے ناول میں قائم ہے اور پانی کا مرکزی کردار بے نظیر کے کردار کی یاد دلاتا ہے۔ مگر خاص بات یہ ہے کہ اس ناول میں بے نظیر کو عشق و محبت کی خوشبو اور رومان پرور ماحول سے دور رکھا گیا ہے۔ مگر اس کا دربدر بھٹکنا اور پانی کی تلاش میں سرگرداں رہنا کبھی سحرالبیان کا حصہ لگتا ہے کبھی گلزارِ نسیم کا گل بکاؤلی کی تلاش میں پھرنا اس ناول میں پانی کی تلاش ہے۔ تاج الملوک کو تو گل بکاؤلی حاصل ہو جاتا ہے مگر اس ناول میں المیہ یہ ہے کہ بے نظیر پوری زندگی پیدا ہونے سے لے کر ایام آخر تک پیاس بجھانے کے لیے پانی کی تلاش کرتا رہا مگر پانی لاحاصل رہا۔ اس ناول کی پوری کہانی داستانوی انداز میں اپنے موضوع بیانی کے اردگرد ہی گھومتی ہے۔ اس ناول میں مگرمچھ شیطانی طاقت کا استعارہ ہے، علامت ہے، اور وہ شیطانی طاقتیں سرمایہ دار بھی ہو سکتی ہیں۔ آج کے تناظر میں اگر اس ناول کو دیکھا جائے تو یہ ایک اہم ناول ہے جس طرح اب فطری اور قدرتی خزانوں پر طاقتور سرمایہ داروں کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے، اور ندیوں کے

پانی کو پینے اور استعمال کرنے پر روک لگائی جا رہی ہے۔ اور اللہ کی بخشی ہوئی اس نعمت کو مشینوں اور موٹروں سے نکال کر بوتلوں میں پیک کر کے کمپنیوں کا لیبل لگا کر فروخت کیا جا رہا ہے عصری حسیت کے نقطۂ نظر سے بھی یہ ناول اہم ہے۔ مگر یہ ایک علامتی ناول ہے جب کہ آج حالات کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ برجستہ اظہار خیال کریں گو کہ اس طریقے سے فن مجروح ہوتا ہے مگر ہمیشہ فن کے لیے بھی ادب تخلیق نہیں کیا جاتا کبھی کبھی فکر کے لیے بھی لکھنا پڑتا ہے اور کبھی عمل کے لیے بھی تخلیق کی جاتی ہے۔ اس ناول سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے، غضنفر علی کے اندر فطری طور پر ایک داستان گو موجود ہے۔ اس کی مثال ان کا ناول ''پانی'' ہے۔ اسلوب داستانوی ہے زبان مسجع و مقفی ہے مگر مشکل پسندی سے پرہیز کیا گیا ہے۔ سلاست اور روانی کے ساتھ تسلسل پورے ناول میں قائم ہے، اور پانی، کا نام مم سے شروع ہو کر آبِ حیات تک پہنچتا ہے۔ مم وہ لفظ ہے جب انسان کا بچہ پہلی بار بولنا شروع کرتا ہے تو دو لفظ ایک مم دوسرا اماں بچہ پانی کو مم کہتا ہے۔ اور وہ جیسے جیسے عمر کی اور علم کی منزلیں طے کرتا ہے مم سے پانی، پانی سے آب اور آب سے آبِ حیات تک پہنچ جاتا ہے، پورے ناول میں پانی اپنے بنیادی وجود کے ساتھ موجود ہے جیسے گئودان کے ہوری کے دل و دماغ پر گائے مرتے دم تک سوار رہتی ہے مگر اس کو دان کے لیے گائے نصیب نہیں ہوتی۔ غضنفر کے ناول پانی کے اسلوب نگارش اور غضنفر کی ناول نگاری کے متعلق بلراج کومل یوں رقم طراز ہیں:۔

> ''غضنفر کا طریق کار استعاراتی، علامتی، تمثیلی اور داستانوی سے پانی انسان کی اور زندہ جانوروں کی بنیادی ضرورت ہے، غضنفر کے یہاں مطالبہ اس بنیادی ضرورت کی تلاش ہے، پانی کی تمثیلی پرواز استعارے علامت اور داستانی طرزِ اظہار کے طفیل انتہائی پر اثر اور بامعنی بن گئی ہے، اور بعض پہلوؤں سے شاعرانہ نوعیت اختیار کر گئی ہے''۔

غضنفر علی کا ایک اور ناول 1994 میں منظرِ عام پر آیا جس کا عنوان ہے کہانی ''انکل''۔ اردو ادب میں فکشن کا شجرۂ نسب تیار کریں گے تو داستان کا شمار اجداد میں ہوتا ہے ناول آباء، اور کہانیاں اور افسانے اولاد اور مختصر کہانیاں نئی نسل میں شمار ہوتی ہیں، ناول کا خمیر ہی داستان سے بنا ہے۔ کہانی کہنے اور کہانی سننے کا عمل بہت قدیم ہے۔ یہی کہانیاں تو نئی نسل کو اپنے اجداد سے قریب کرتی ہیں۔ یہ ناول کئی مسئلوں کی طرف اشارے کرتا ہے اور اس ناول میں بھی علامت نگاری سے پورا پورا کام لیا گیا ہے۔ کہانی ''انکل'' کی کہانی تلاش معاش سے شروع ہوتی ہے، انسان اپنے اہل و عیال کی ضرورتیں و حاجتیں پوری کرنے کے لیے طرح طرح کے کام کرتا ہے۔ اس ناول میں کہانی انکل جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے، اس نے بھی طرح طرح کے کام کیے مگر زندگی میں ناکام رہا اور پھر جانے کیسے وہ کہانیاں سنانے کا دھندا اپنا بیٹھتا ہے۔ وہ ولوگوں کو کہانیاں سناتا اور پیسے کماتا ہے۔ غضنفر صاحب بہت سوچ سمجھ کر ناول لکھتے ہیں بلکہ وہ موضوع، کردار اور پلاٹ سب کو بہت محنت سے تخلیق کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کے ناولوں میں کرداروں کو مرکزیت حاصل نہیں ہوتی، موضوع اور خیال کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، چاہے ان کا ناول پانی ہو کینچلی ہو، کہانی انکل ہو یا دویہ بانی یا مانجھی۔

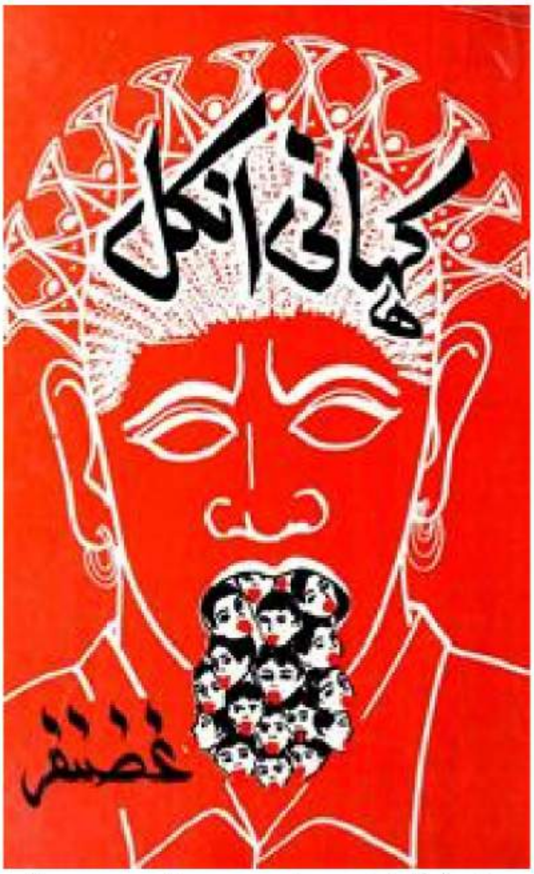

کہانی انکل کی کہانیاں بھی ذریعۂ معاش سے جڑی ہوئی ہیں، کہانی انکل ناول کا مرکزی کردار کہانیاں سنا کر پیسے کماتا ہے اور سپیرا پہلے سانپ ڈالتا ہے پھر نکالتا ہے۔ ڈگڈگی والا نیولے اور سانپ کی لڑائی سے پیسے کماتا ہے، مجاور جھاڑ پھونک اور فقیری سے اور سنگ ریزے بیچ کر روزی کماتا ہے، ان کہانیوں میں جو لطیف اشارے ہیں کہ پیشہ ور لوگ کس طرح عام لوگوں کو بیوقوف بنا کر پیسے کماتے ہیں، اس کہانی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ کہانی انکل بار بار ناکام ہوتا رہا مگر ہار نہیں مانتا اور بھوک کی شدت

اسے کہانیاں سنانے کا دھندا اپنانے پر مجبور کرتی ہے، ویسے ہی سپیرے بھی پیٹ بھرنے کے لیے یہ کام کرتے ہوں گے اور سانپ اور نیولے کی دلچسپ لڑائی، بندر بندریا کے جھگڑے اور بندریا کا ناچ، بھالو کی ساس بہو کی لڑائی سے عام لوگوں کو تفریحِ طبع کا سامان بھی پیدا کرتا ہے اور اپنے معاش کا بھی۔ ''باہر کی بھیڑیں'' میں بڑا لطیف اشارہ ہے ہماری قوم کی طرف۔ ''ٹھپے والا سانڈ'' ایک بے لگام جابر کی علامت ہے اور اس بات کا اشارہ کہ اگر ظالم کو گھر میں پال پوس کر اس لیے بڑا کیا جائے کہ وہ دوسروں کا نقصان کرے گا تو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کا سانڈ اسے بھی نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گا۔

''سپنا ہوئی'' بھی ایک ایسے گناہ اور ظلم کی کہانی ہے جو سماج خود پیدا کرتا ہے، کسی کا بار بار استحصال کیا جائے اور معاشرے میں اس کے حقوق غصب کیے جائیں اور سماج میں ترسکار کیا جائے تو ایسی ہی برائیاں پیدا ہوتی ہیں جو خود اس سماج کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں اور اس کی بنیادوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ یہ ناول عصرِ حاضر کے تناظر میں بھی بہت اہم ہے۔

یہ بھی ایک طرح کا آتنک واد ہے جو ظلم کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور جنسی عصمت دری اس کی بامہذب مثال ہے کہ لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی سرِ عام ان کی عصمت بیچی جاتی اور خریدی جاتی ہے، مگر وہائٹ کالر لوگ در پردہ یہ تجارت بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ جو نہایت مذموم اور شرمناک ہے۔

اور پھر ایک ایسی تحریک اور اتحاد کا آخری اشارہ ہے کہانی ''انکل'' کی زبان کا کٹنا اور ہزاروں بچوں کا یہ احتجاجی جملہ:

''کہانی انکل کی زبان نہیں کٹی ہے بلکہ ہمارے منہ میں آگئی ہے''

ٹھیک اسی طرح جب آزادی کے متوالے پھانسی پر چڑھتے تھے تو ان کا کہنا تھا ایک بھگت سنگھ کو پھانسی ہوگی تو ہزاروں بھگت سنگھ پیدا ہوں گے۔

کہانی 'انکل' کی اہمیت اور افادیت کے نعرے میں پیغام آفاقی صاحب نے بڑی اچھی بات لکھی ہے:

''کہانی 'انکل' میں مرکزی کردار کہانی انکل تخلیقی فکر (Creative Thinker) کی حیثیت سے ابھرتا ہے اور لوگوں کی فکر میں ایک نئے تاریخی ڈائمنشن کا اضافہ کرتا ہے افلاطون جس شاعر کے لیے سماج میں کوئی جگہ متعین نہیں کر پایا تھا اسی جگہ کا تعین اس ناول میں مرکزی کردار کہانی 'انکل' کر دیتا ہے۔ فارم کے لحاظ سے یہ ناول اچھوتا ہے اور فکر کے اعتبار سے اوریجنل۔ ان دنوں مشرق میں تخلیقیت کروٹ لے رہی ہے۔ یہ ناول بھی انہی کروٹوں میں سے ایک کروٹ ہے۔ یہ ایک بڑا ناول ہے اور ناول میں کیا انقلاب برپا ہو رہا ہے یہ جاننے کے لیے اس ناول پر غور کرنا بہت ضروری ہے''۔

جدید ادیبوں نے اکیسویں صدی میں اردو ادب کو کچھ اچھے اور نئے ناول عطا کیے ہیں ان میں غضنفر علی کا ایک اور ناول دیبیہ بانی بھی ہے۔ شناخت کے اعتبار سے اس ناول میں اردو ادب میں دلت مسائل کے نقوش اور ان پر ظلم کی کہانی پہلی مرتبہ پیش کی گئی ہے۔ یوں تو غضنفر صاحب نے اس سے پہلے دو تین تجربے کیے ہیں۔ اسلوب شاعرانہ، زبان زور آور اور رواں دواں قافیوں سے سجی ہوئی انداز داستانوں اور تسلسل مثنوی جیسا اپنے اسلاف کے فن کو زندہ و تابندہ رکھنے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ کیچلی اور کہانی انکل بہترین ناول ہیں اور چوتھا ناول دو یہ بانی بھی ایک اہم سماجی مسائل کو مرکز میں رکھ کر تخلیق کیا گیا ہے، یہ مسئلہ اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جب معاشرہ عمل کی بنا پر درجات میں منقسم ہو گیا تھا اور عمل کی بنیاد پر کی گئی تقسیم وقت کے ساتھ ساتھ ذات پات اونچ نیچ اور دلت سماج میں تبدیل ہو گئی۔

ناول 'دو یہ بانی' معاشرے کے بے حد قدیم مسئلہ سے شروع ہوتا ہے، دراصل انسان معاشرے میں رہتا ہے اور ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب معاشرے کا ایک حساس انسان۔ اسی لیے ادیبوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ کبھی افسانوں میں کبھی ناولوں میں اور یہ بھی سچ ہے دلتوں سے متعلق اس معاشرتی مسائل کو ناولوں اور افسانوں نے ہی پہلے اجاگر کیا ہے حالانکہ اب دلتوں کے ساتھ وہ تحقیر آمیز سلوک نہیں ہوتا۔ نہ ہی ظلم ہوتا ہے جو برسوں پہلے ہوا کرتا تھا۔ اب تو انہیں قانون کا تحفظ حاصل ہے۔ اب وہ مندر میں بھی جاتے ہیں اور ساتھ میں بیٹھ کر کھانا بھی کھاتے ہیں۔ دو یہ بانی کا مرکزی کردار بالیشور سمجھ دار حساس اور سب سے بڑی بات ایک اچھا اور باشعور انسان ہے جو ظلم کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ بالیشور بزدل اور مصلحت پسندی سے کام نہیں لیتا بلکہ بے خوفی و بے باکی سے کام لیتا ہے اور اپنے بابا کو کالا ناگ اور سانپ کہتا ہے۔ جو کمزور جانوروں اور انسانوں کو ڈس لیتا ہے۔ اس ناول کا اسلوب بہت رواں اور بیانیہ اتنا زور آور ہے کہ قاری کی توجہ برقرار رہتی ہے۔ یکے بعد دیگرے غضنفر کے ناولوں کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ بلاشبہ غضنفر صاحب کو بیانیہ پر پوری طرح عبور حاصل ہے۔ وہ ایک ذمہ دار اور حساس فکشن نگار ہیں۔ ان کے تمام ناولوں میں زندگی کے اہم مسائل اور ضرورتوں کو مرکزیت حاصل ہے۔ پیاس، بھوک، تلاشِ معاش، دلتوں کے ساتھ ظلم و زیادتی، معاشرتی مظالم، سرمایہ داری تمام مسائل کو موضوع بنا کر مقصد کے ساتھ ناول کو تخلیق کیا گیا ہے۔ اسلوب میں فن کا پورا پورا استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں قافیہ پیمائی تو کہیں شاعرانہ انداز بیان ہے۔

پروفیسر حسین الحق دو یہ بانی کی خوبیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دو یہ بانی اس ناول کا قصہ ایسا اچھوتا ہے کہ اس سے پہلے گویا یہ قصہ اردو میں بیان نہیں کیا گیا۔ وہی حال زبان کا ہے کہ اردو ناول میں اب تک ایسی زبان استعمال نہیں کی گئی۔ اسلوب ایسا رواں رہا کہ پانی کے بہاؤ کی طرح بہتا چلا جاتا ہے اور بہائے لیے جاتا ہے۔ یہ ناول اتنا زور آور ہے کہ آپ کو اسی کی مرضی کے مطابق چلنا پڑے گا۔ قصہ، زبان، اسلوب اور بیانیہ کے بعد اسی ناول کا ایک اور انوکھا اثر ہے کہ اردو میں پہلی مرتبہ ہے جس کے لیے شاعری ضروری اور ناگزیر ہوگئی۔''

ڈاکٹر سید حیدر علی اپنی کتاب ''جدید ناول سمت و رفتار'' میں غضنفر کی ناول نگاری اور ان کے ناولوں کی اہمیت کے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''دو یہ بانی کو کینچلی کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اردو میں دلت ناولوں میں لٹریچر کا یہ پہلا نمونہ ہے۔ دلتوں کی جدوجہد کو بالیشور جیسے کردار ابھارتے ہیں مگر منوواد کی نظام کی مضبوط گرفت کے سبب دلت سماج محض ایک تماشائی سا نظر آتا ہے۔ اس ناول کی ایک بڑی خوبی یہ ہے یہ ناول دلت مسئلہ پر اردو میں اولیت کا شرف رکھتا ہے۔''

(صفحہ 948 جدید ناول سمت و رفتار)

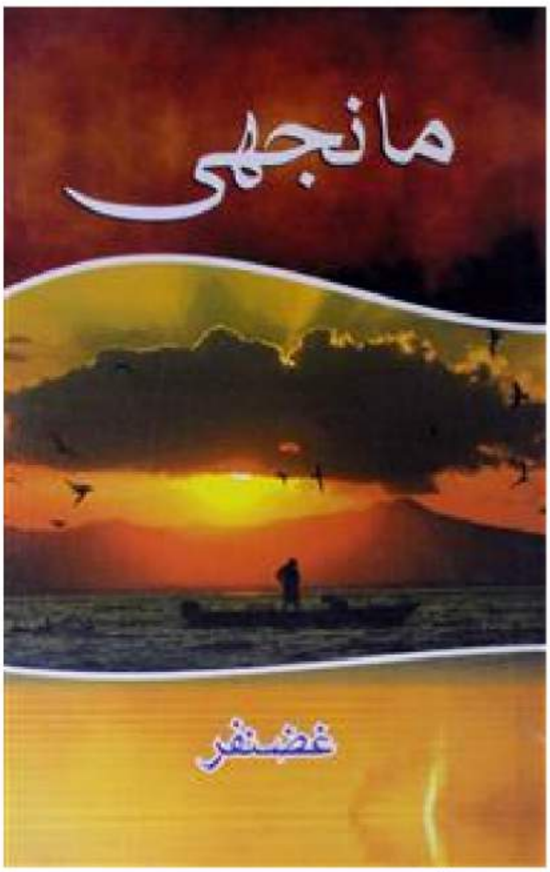

یوں تو غضنفر صاحب بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں یا 1980 کے بعد کے ناول نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں، مگر ان کا قلم اکیسویں صدی میں بھی اس برق رفتاری سے رواں دواں ہے اور انھوں نے اردو ادب کو کم و بیش کئی ناول عطا کیے ہیں۔ دو یہ بانی سے لے کر مانجھی تک ان کے ناولوں کا شمار اکیسویں صدی کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔ دو یہ بانی دلت مسائل پر تحریر کردہ اولین ناول ہے۔ فسوں ایک کیمپس ناول ہے۔ وش منتھن ہندو میتھولوجی پر مبنی ایک سنجیدہ ناول ہے۔ مم، شوراب اور مانجھی تمام ناول گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ غضنفر صاحب کو الٰہ آباد

جسے سنگم نگری بھی کہتے ہیں بڑی محبت رہی ہے اور مانجھی اسی سنگم نگری کی تین ندیوں گنگا جمنا سرسوتی سے عقیدت، محبت اور شردھا کی کہانی ہے۔ مانجھی اور وی این رائے اس ناول کے مرکزی کردار ہیں وی این رائے الٰہ آباد اپنے بھائی دھرم ناتھ رائے کے گھر آتے ہیں اور پھر سنگم گھومنے جاتے ہیں حالانکہ وہ کٹر ہندو مذہب کے پیروکار نہیں بلکہ وہ انسانیت کے علم بردار ہیں۔ ناول کچھ ایسے ہی مکالموں سے شروع ہوتا ہے۔

''بھائی صاحب الٰہ آباد تک آیا ہوں تو سوچتا ہوں کہ سنگم بھی ہو آؤں''

''سنگم جاؤ گے؟'' دھرم ناتھ رائے وی این رائے کو گھورنے لگے۔

ناول مانجھی کا کردار حقیقی کردار ہیں ویں این رائے کو اہل الٰہ آباد اور بالخصوص ادب کے لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ ہندی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے اور شعبۂ پولیس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وی این رائے نے 1992 کے دنگوں میں شہر الٰہ آباد کے مسلمانوں کی بہت حفاظت کی تھی، وہ قومی یکجہتی اور ایکتا کی مثال تھے۔ نہ صرف وہ اچھے انسان تھے بلکہ جمہوری فکر کے حامل ایک حساس ادیب ذمہ دار پولیس آفیسر بھی تھے۔ دوسرا مرکزی کردار ویاس ہے جو مانجھی ہے۔ سنگم پر ناؤ چلاتا ہے اور اپنی روزی روٹی کا گزارا کرتا ہے۔ دی این رائے کی طرح ویاس قابل نہیں، چنیودھاری نہیں، مگر اس کے اندر شعور ہے احساس ہے اپنی قدروں کا وہ پاسدار ہے اور پامال ہوتی روایتوں کا اسے قلق ہے۔ دل میں ہوس نہیں، اطمینان ہے اور گنگا جمنا سرسوتی سے عقیدت ہے۔ پرندوں سے محبت ہے۔ اسے رنگوں کی پہچان ہے اور کئی کہانیوں کا گیان ہے۔ وہ کہتا ہے:

''اس سمے ہم جمنا میں ہیں اس پانی کا رنگ ہرا ہے۔ یہ رنگ پہلے اور ہرا تھا دھیرے دھیرے اس میں سیاہی گھلتی گئی اور اس کا ہراپن ہلکا ہوتا گیا''۔

(صفحہ 18، مانجھی غضنفر)

''صاحب! سروسوتی جی بھلے ہی لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں پرنتو وہ اپنا کام اندر اندر کرتی رہتی ہیں۔ اپنا رنگ چڑھاتی رہتی ہیں۔ اپنا اثر دکھاتی رہتی ہیں۔ یہ انہیں کی کرپا ہے کہ یاتریوں کو پانے کے لیے میں اتاؤلا نہیں رہتا، اور بنا مول تول کیے مجھے آپ جیسے یاتری مل جاتے ہیں، اور جب نہیں ملتے تب بھی بے چینی نہیں ہوتی، یہ انہیں کی کرپا ہے کہ صاحب ان بھوکے پرندوں کو دیکھ کر اس بھیڑ میں بھی کچھ آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ یہ انہیں کا چمتکار ہے کہ جل رانی آج بھی زندہ ہے۔ یہ انہی کی مہما ہے کہ آج بھی کہیں کہیں پر ہریالی اور کسی کسی دل میں صفائی باقی ہے۔ یہ انہیں کا کرشمہ کہ جمنا میں اب بھی تھوڑا بہت ہراپن اور گنگا میں اجلاپن دکھائی دیتا ہے''۔ (صفحہ 134 مانجھی، غضنفر)

اس ناول میں دنگوں میں بچے کی جان بچانے کا جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانیت ابھی باقی ہے۔ دی این رائے شعبہ پولیس سے وابستہ تھے اور انھوں نے فرقہ پرستی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ وہ ماضی ان کو یاد آتا ہے کہ وہ اس وقت ان کی پوسٹنگ الٰہ آباد میں تھی۔ انسانیت، محبت اور قومی یکجہتی کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ بھی حقیقی ہے۔

''ہٹ جا ہیے ورنہ یہ ترشول آپ کے سینے میں بھی اتر جائے گا''

''اتر جائے، پرواہ نہیں، مگر میں ہر حال میں اس بچے کی رکشا کرونگا اسے بچاؤں گا''

بوڑھا بچے کے آگے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ تو ٹھیک ہے مریے''

ترشول ہوا میں لہرایا تھا اور پلک جھپکتے ہی بوڑھے کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا'' (صفحہ ۱۳۵، مانجھی، غضنفر)

بیسویں صدی، ہی نہیں اکیسویں صدی میں بھی غضنفر صاحب منفرد اسلوب کے حساس اور سنجیدہ فکشن نگار ہیں۔ ان کا اپنا اچھوتا انداز ہے ان کو بیانیہ پر کمال حاصل ہے۔ غضنفر علی کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور مشاہدہ بھی گہرا ہے۔ وہ قدامت پرستی کے عیوب پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ اور ترقی پسندی پر بھی جدیدیت سے بھی فیض اٹھاتے ہیں۔ علامت نگاری سے کام ضرور لیتے ہیں مگر نگاہ معاشرے کے تمام مسائل و مصائب پر رکھتے ہیں۔ خواہ وہ پانی کی تلاش ہو یا تلاش معاش صرف دلتوں کے ساتھ ناروا سلوک پر وہ قلم نہیں اٹھاتے بلکہ مردانہ سماج میں عورت کی مضبوطی، دیدہ دلیری اور بہادری کو کس طرح کمزور کیا جاتا ہے، مرد کی انا کو تسکین کیسے ملتی ہے۔ یہ تمام نکات ان کے ناول میں موجود ہیں۔ بلاشبہ ان کے ناول دعوت فکر دیتے ہیں۔ ذہن کو جھنجھوڑتے ہیں۔ بلاشبہ تخلیقیت اور ناول نگاری کے فن میں اپنا الگ انداز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

□□□

Dr Kahkashan Irfan
Assistant Professor of Urdu
Dr A.H.Rizvi P.G. Degree College
Kaushambi Mo. 7054003555
Email: dr.kahkashanirfan1980@gmail.com

محمد ارشد کسانہ

اکیسویں صدی کے اردو سفرناموں میں خواتین کا حصہ

سفر نامہ غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔سفر نامے کا تعلق اس زمانے سے ہے جب تحریر کا وجود بھی نہ تھا۔تب لوگ زبانی اپنے اسفار کی روداد سنایا کرتے تھے اور باقی لوگ دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔پھر تحریر وجود میں آئی اور سفر نامہ نے تحریری صورت اختیار کر لی۔یوں باقاعدہ طور پر صنفِ سفر نامہ کا آغاز ہوا۔

سفر نامہ ایک اعلیٰ پایہ کی صنف ہے۔اس نے دنیا کا دل بھی بہلایا ہے اور دنیا کی ترقی میں کافی اہم رول بھی ادا کیا ہے۔اکثر لوگ جب دور دراز ممالک کے اسفار پر جایا کرتے تھے تو وہاں کی سیاسی، سماجی، معاشی، گویا ہر طرح کی ترقی کا بغور جائزہ لے کر اپنے سفر ناموں میں شامل کر دیا کرتے تھے۔اس چیز کا دنیا نے فائدہ اٹھایا اور وہ بھی ترقی کی طرف بڑھنے لگے۔رہی بات دل بہلاوے کی تو ہر انسان کا شوق ہوتا ہے کہ وہ سیر وتفریح کرے، دنیا کی نئی نئی جگہوں اور نئے نئے ممالک کو دیکھے۔مگر ہر انسان اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تمام خواہشات پوری کر سکے۔البتہ سفر ناموں کے ذریعے انسان اپنی یہ خواہشات پوری کرتا آیا ہے۔اس لیے سفر نامہ کو اعلیٰ پایہ کی صنف قرار دینا غلط نہیں ہے۔

اردو میں سفر نامے کا باقاعدہ آغاز یوسف حان کمبل پوش کے سفر نامے ''تاریخ یوسفی'' سے ہوا۔1937 میں انھوں نے انگلستان کا سفر کیا اور 1847 میں یہ سفر نامہ کتابی صورت میں دہلی سے شائع ہوا۔اس کے بعد ہم اردو ادب میں سفر نامہ کی ایک اچھی خاصی اور مضبوط روایت دیکھتے ہیں۔جہاں تک خواتین کی بات ہے تو یہ بات سچ ہے کہ سفر ناموں میں خواتین کا حصہ کافی محدود ہے۔محدود اس لیے کیونکہ خواتین کو شروع سے ہی اسفار سے دور رکھا گیا ہے۔باہر جانے کا ذمہ ہمیشہ سے ہی مردوں کے کاندھوں پر رہا ہے۔مگر جوں جوں دنیا ترقی کی طرف بڑھتی گئی عورت اس پہرے سے آزاد ہوتی گئی اور بعد میں خواتین بھی اس صنف کا حصہ بنیں۔دنیائے ادب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کے لکھے ہوئے کئی سفر نامے پوری دنیا میں مشہور ہیں اور دنیا نے ان کی اہمیت کو مانا ہے۔اردو ادب میں بھی خواتین کے بے شمار سفر نامے موجود ہیں۔اگر تاریخی طور پر جائزہ لیا جائے تو اکثر ادباء نے نازلی رفیعہ سلطان کے سفر نامے ''سیر یورپ'' کو خواتین کے حوالے سے اردو کا پہلا سفر نامہ مانا ہے۔یہ سفر نامہ 1908 کو شائع ہوا۔اس کے بعد ہمیں اردو ادب میں خواتین کے سفر ناموں کی ایک اچھی روایت دیکھنے کو ملتی ہے اور یہ روایت اسی آب و تاب سے آج بھی جاری ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ٹکنالوجی نے جو انسانی زندگی کو متاثر کیا ہے وہ کسی چمتکار سے کم نہیں ہے۔ان دو دہائیوں میں ٹکنالوجی کی کارگردگی کی بدولت لوگ اس پوری صدی کو ٹکنالوجی کی صدی کہتے ہیں۔نئی صدی میں ٹکنالوجی اور سائنس کی وجہ سے ہر چیز میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات اردو ادب پر بھی پڑے ہیں بلکہ ہر صنف نے ان اثرات کا سامنا کیا ہے اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو سائنس اور ٹکنالوجی کے سب سے زیادہ اثرات سفر ناموں پر پڑے ہیں۔کیونکہ سائنس اور ٹکنالوجی نے پیدل سفر کرنے والوں کو گاڑیوں اور

جہازوں میں بٹھا کر ان کی رفتار اتنی تیز کردی ہے کہ مسافروں کو اپنے مقصد کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بغور دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ آج کل تو قلم کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اب تو ویڈیو کیمرے کے ذریعے پورے سفر کو قید کیا جاتا ہے۔ البتہ جذبات اور تاثرات کے اظہار کے لیے قلم کا استعمال بے حد ضروری ہے۔ اس لیے سفرنامے کا مستقبل روشن ہے۔

نئی صدی میں اردو کے بے شمار سفرنامے منظر عام پر آئے ہیں۔ 2000 سے لے کر 2020 تک اردو کے قریب چالیس سفرنامے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض سفرناموں نے کافی شہرت حاصل کی ہے، جیسے ''سوئے حجاز'' (حیدر قریشی)، ''دنیا میرے آگے'' (مفتی محمد تقی عثمانی)، ''صحرا میں شام'' (قمر علی عباسی)، ''چراغ راہ گزر'' (ظہیر انور)، ''دنیا خوبصورت ہے'' (عطاالحق قاسمی)، ''سفر ہے شرط'' (ڈاکٹر محبوب راہی) ''کہاں سے لوٹ آئے'' (احمد بدر)، ''امریکن مسلم'' (احمد شکور)، ''سفر عشق'' (طارق محمود مرزا) وغیرہ۔ نئی صدی میں سفرنامے کی اس روایت میں خواتین کے سفرناموں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ آزادی کے بعد ہی ہمارے ہاں ایسا ماحول بنا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ چلنے کی ہمت رکھنے لگیں۔ آہستہ آہستہ خواتین ہر شعبہ میں نظر آنے لگیں۔ اردو ادب میں بھی تقسیم سے پہلے کچھ اکا دکا خواتین کا ہی نام آتا ہے۔ تقسیم کے بعد کافی تعداد میں خواتین اردو ادب کے میدان میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے مردوں کے شانہ بشانہ بہترین ادب تخلیق کیا۔ اور یہ بہتری ہمیں ان کے سفرناموں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام تک سفرنامہ کے میدان میں کافی خواتین اپنا نام درج کروا چکی تھیں۔ اکیسویں صدی میں کچھ نئی خواتین اس روایت کا حصہ بنی ہیں۔ ہم درج ذیل ان تمام خواتین کا سرسری جائزہ لینے کی کوشش کریں گے جن کے سفرنامے نئی صدی میں شائع ہو کر کسی قدر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

نئی صدی میں خواتین سفرناموں کے حوالے سے اے۔ امیر النساء کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا تعلق تامل ناڈو سے ہے اور وہ بنیادی طور پر فکشن نگار ہیں۔ 2001 میں ان کا سفرنامہ ''ارض مقدس میں چند دن'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ وہ مغربی ایشیا میں سیر و سیاحت اور مقدس جگہوں کی زیارت کی غرض سے گئی تھیں۔ عمان، بغداد، کوفہ، مقام کربلا، یروشلم، قاہرہ، مکہ، مدینہ وغیرہ جیسی تاریخی جگہوں پر وہ گئیں اور ان کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات کو بھی اس سفرنامے میں درج کیا ہے۔ یہ سفرنامہ کافی مختصر ہے مگر جلد بازی کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ 28 دن کے اس سفر کو انھوں نے کافی چابکدستی سے تحریر کیا ہے۔ صغرا مہدی اردو کی اہم ادیبہ ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ کر مشہور ہو چکی ہیں۔ ان کے کئی سفرنامے بھی شائع ہو چکے ہیں جیسے ''سیر کر دنیا کی غافل''، ''ایک بار پھر امریکہ'' وغیرہ۔ اکیسویں صدی میں ان کے سفرناموں کی کتاب ''میخانوں کا پتہ'' (2005) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس میں ان کے پانچ اسفار کی روداد ہے جو انھوں نے 1977 سے 2001 کے دوران کیے تھے۔ پہلا سفرنامہ ''میخانوں کا پتہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مکہ، مدینہ، عراق، ایران اور شام کے سفر کی روداد ہے۔ دوسرا سفرنامہ ''سات دن کیکو کے دیس میں'' کے نام سے ہے۔ یہ سفرِ جاپان کی روداد ہے۔ تیسرا سفرنامہ ''سمندر سمندر۔ سمندر اور ٹک ٹک'' کے نام سے درج ہے۔ یہ بینکاک، بالی اور پھکیت کے اسفار پر مشتمل ہے۔ چوتھا سفرنامہ ''ایک بار پھر امریکہ'' اس سے پہلے بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا۔ پانچواں سفرنامہ ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' لندن اور اسپین کے اسفار پر مشتمل ہے۔ یہ تمام مختصر سے سفرنامے ہیں مگر دلچسپی سے پر ہیں۔

نگار عظیم بحیثیت افسانہ نگار کافی مشہور ہیں۔ انھوں نے شاعری، افسانہ نگاری، تنقید وغیرہ کے ساتھ ساتھ ایک سفرنامہ بھی لکھا ہے۔ 1999 میں انھوں نے ازبکستان کا سفر کیا اور 2006 میں انھوں نے اس کی روداد کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس سفرنامہ میں ہمیں ازبکستان کی تہذیب، ماحول، ہندستانی کلچر کا رواج، اردو زبان کا چلن اور ادبی ماحول کا خوبصورت نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ 2008 میں رئیس فاطمہ کا سفرنامہ ''میرے خوابوں کی سرزمین'' منظر عام پر آیا۔ یہ سفرنامہ کتابی شکل میں آنے سے پہلے ہی قسط وار اخباروں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا۔ رئیس فاطمہ ادبی دنیا میں پہلے ہی مشہور تھیں۔ ان کی کئی کتابیں ادبی دنیا تک پہنچ چکی تھیں۔ 2005 میں وہ اپنے شوہر قاضی اختر جوناگڑھی کے ہمراہ ہندستان آئیں۔ یہاں انھوں نے دہلی، آگرہ، جوناگڑھ، فتح پور سیکری اور احمد آباد کی سیر کی اور واپس جا کر اپنے سفر کی پوری روداد قلم بند کی۔ اس سفرنامے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ مصنفہ نے ہر جگہ کا تاریخی جائزہ لیا ہے یعنی جس مقام کو انھوں نے دیکھا اس کی تفصیل پیش کی۔ شہر دہلی اور دہلی کی جامع مسجد کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جس وقت ہم دونوں جامع مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اچانک یہ خیال آیا کہ ان سیڑھیوں پہ چڑھ کے کون کون نہ آیا ہوگا۔ ان سیڑھیوں نے کس کس کی قدم بوسی نہ کی ہوگی 'شاہ جہاں' اورنگ زیب' دارا شکوہ' مرزا کامران' شہزادہ مراد' بہادر شاہ ظفر' میر' غالب' خواجہ میر درد اور نہ جانے کتنی ہستیاں

جن کے نام آج بھی تاریخ اور ادب کی کتابوں میں زندہ ہیں
۔ ہم نے اور اوپر چڑھ کر اطراف میں دیکھا تو ہر طرف
روشنیوں کی یلغار تھی، دلی ایک طلسم لگ رہی تھی جس نے اپنے
سحر میں تاریخ کو جکڑا ہوا تھا۔''

(میرے خوابوں کی سرزمین، رئیس فاطمہ، 2008، ص 74)

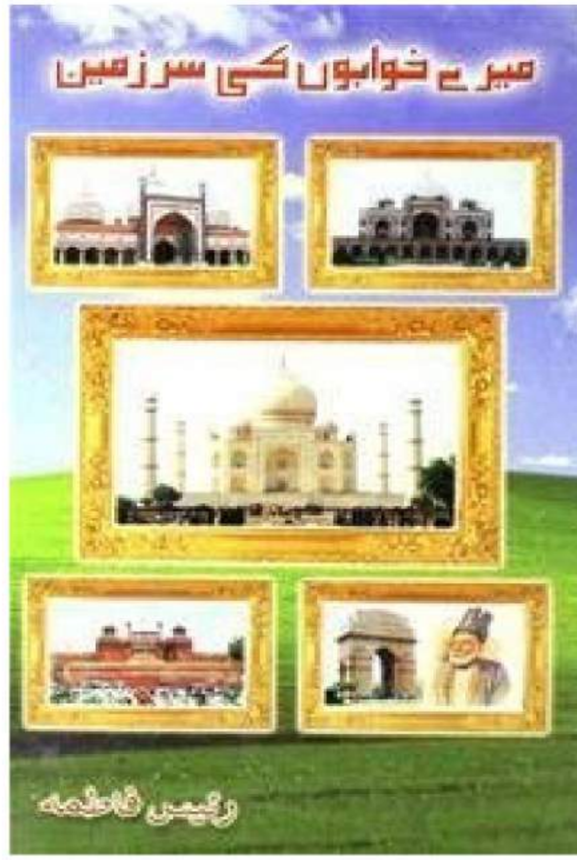

اسی طرح اس سفرنامہ میں ہمیں مسلمانوں، مغلوں اور اردو ادب کی تاریخ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس میں تقسیمِ ہند کے واقعات کا ذکر بھی خاص طور پر کیا گیا ہے۔ دراصل مصنفہ تقسیمِ ہند کے سبب بچھڑے ہوئے اپنے رشتہ داروں سے ملنے ہندستان آئی تھیں اس لیے اس پہلو کا سفرنامہ میں آنا فطری تھا۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھا سفرنامہ ہے۔ رئیس فاطمہ کے اسلوب نے اس سفرنامے کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی کا تعلق جموں و کشمیر سے ہے۔ ادبی دنیا میں یہ بھی اپنی پہچان بنا چکی ہیں۔ 2010 میں ان کا سفرنامہ ''شہر ہائے نور'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ یہ مذہبی سفرنامہ ہے۔ 2004 میں انھوں نے حج کا فریضہ انجام دیا یہ سفرنامہ اسی سفر کی روداد ہے۔ یہ سفر انھوں نے سرینگر سے شروع کیا تھا اور ابتدا سے ہی حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ان کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے وہاں کے مقدس مقامات، ماحول، احباب سے ملاقات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سفرنامے میں اپنے عقیدے کے متعلق انھوں نے اپنے جذبات اور تاثرات کا عمدہ اظہار کیا ہے۔

سلمیٰ اعوان بنیادی طور پر فکشن نگار ہیں۔ تانیثیت کے حوالے سے ان کی کئی کہانیاں کافی مشہور ہیں۔ اکیسویں صدی میں ان کے دو سفرنامے منظر عام پر آئے۔ ''روس کی ایک جھلک'' 2010 میں شائع ہوا۔ 480 صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ کافی طویل ہے۔ سلمیٰ اعوان نے اسلام آباد سے اس سفر کا آغاز کیا اور واپس آنے تک جس جس چیز پر انھوں نے نگاہ ڈالی اس کی منظر کشی لاجواب پیرائے میں کی ہے۔ روس کی تہذیب، ماضی اور موجودہ حالات پر ان کی خاص توجہ تھی۔ اس سفرنامے میں ان کا اسلوب کافی متاثر کن ہے۔ 2017 میں ان کا دوسرا سفرنامہ ''اٹلی ہے دیکھنے کی چیز'' منظر عام پر آیا۔ یہ سفرنامہ اٹلی کے سفر کی روداد ہے۔ اس میں مصنف کی تاریخ سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اٹلی میں وہ کئی تاریخی جگھوں پر گئیں اور ان کا بغور جائزہ لے کر اپنے تاثرات اس سفرنامے میں درج کیے ہیں۔ باقی وہاں کی تہذیب، ماحول اور وہاں کے ادب اور ادیبوں کا ذکر بھی ہمیں اس سفرنامے میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ سلمیٰ اعوان کے یہ دونوں سفرنامے کافی اہم ہیں۔ اکیسویں صدی میں خواتین کے حوالے سے سفرنامہ نگاری میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ کیونکہ ان کے سفرناموں میں ہمیں کہیں کوئی خامی محسوس نہیں ہوتی۔ نہ ہی کہیں جلد بازی کا احساس ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں اکثر سفرنامے اختصار کے شکار ہیں۔ مگر سلمیٰ اعوان نے جس موضوع کو بھی اٹھایا اس کو کافی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ باقی ان کی سادہ زبان نے قاری کا تجسس کہیں ٹوٹنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر صبیحہ انور کا شمار بھی اردو کی اہم ادیباؤں میں ہوتا ہے۔ 2013 میں ان کا سفرنامہ ''دیکھا ہے ہم نے استنبول'' شائع ہوا۔ استنبول دنیا کا کافی مشہور شہر ہے۔ تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس شہر کے ساتھ بڑی بڑی حکومتوں کا تعلق رہا ہے۔ ماضی کے بے شمار واقعات اور حادثات کا یہ شہر گواہ ہے۔ جس انسان نے بھی اس شہر کے بارے میں سنا ہے وہ اس شہر کو دیکھنے کی خواہش دل میں رکھتا ہے۔ یہی خواہش صبیحہ انور کے اندر بھی موجود تھی۔ 2011 میں ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ 2011 میں وہ ہندستان سے استنبول گئیں۔ وہاں ڈاکٹر صبیحہ انور نے دس دن گزارے اور ان دس دنوں میں انھوں نے استنبول کے تمام اہم مقامات کی سیر کی۔ استنبول کے متعلق وہ سفرنامے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''استنبول ایک شہر ہی نہیں، ایک سحر بھی ہے۔ میں نے مغرب

اورمشرق کے کئی شہر دیکھے ہیں، وہ بہت اچھے بھی لگے۔ بعض باتوں کے لیے ان کی گرویدہ بھی ہوں اور ان کی یادیں اکثر دل ودماغ کو روشن کردیتی ہیں لیکن ۔۔۔۔استنبول کی بات ہی کچھ اور ہے۔"

(دیکھا ہے ہم نے استنبول، صبیحہ انور، 2013، ص10)

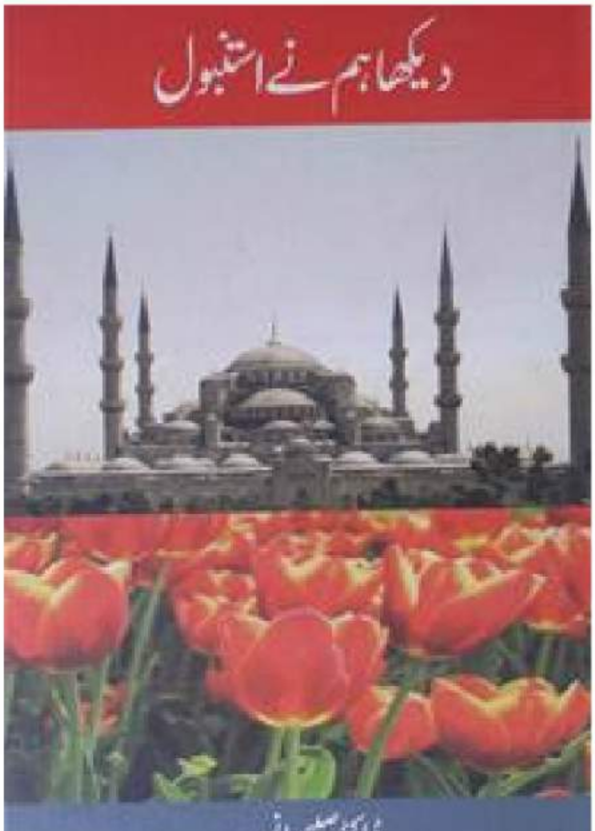

استنبول میں انھوں نے نیلی مسجد، گرینڈ بازار، توپ کاپی محل، مسجد سلیمانیہ، قصر خدیو، پرنس آئی لینڈ وغیرہ جیسے مقامات کو دیکھا۔اور ان مقامات کو دیکھ کر تاریخی طور پر ان کا جائزہ لیا اس کے علاوہ وہاں کی تہذیب، لوگوں کا رہن سہن اور واقعات کی منظر کشی کے بہترین نظارے ہمیں اس سفرنامے میں دیکھنے کو ملتے ہیں ۔استنبول دنیا کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ خاص طور پر ماضی میں یہ شہر اسلامی حکومت کا کافی اہم مرکز رہا ہے ۔ مصنفہ نے اس تاریخ سے کافی گہری دلچسپی دکھائی ہے ۔ مجموعی طور پر یہ ایک مکمل اور بہترین سفرنامہ ہے۔

عشرت معین سیما نے اردو دنیا میں بحیثیت شاعرہ اور افسانہ نگار نام بنایا ہے۔عشرت معین سیما کافی عرصے سے جرمنی میں مقیم ہیں۔وہ پیشے سے صحافی ہیں اور جرمنی میں وزارت داخلہ کے محکمہ پناہ گزین میں اردو اور ہندی کی مدرس اور مترجم ہیں ۔اس کے علاوہ وہاں کئی ہندی اور اردو معلم کی حیثیت سے یونیورسٹیوں کے ساتھ جڑی رہی ہیں ۔ اردو کی کئی انجمنوں میں بحیثیت رکن کام کررہی ہیں ۔انھوں نے اپنی زندگی میں کئی اسفار بھی کیے ہیں مگر کوئی سفرنامہ تحریر نہیں کیا۔2015 میں ان کا پہلا سفرنامہ "اٹلی کی جانب گامزن" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ سفر انھوں نے جرمنی سے اٹلی کا کیا تھا۔دراصل اٹلی کے ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ نے عشرت معین سیما کو جرمن زبان کے اردو اور ہندی زبان کے متعلق تحقیق اور ترجمہ کا ایک پروجیکٹ دیا تھا۔ اسی پروجیکٹ کے سلسلے میں 2011 میں ریسرچ ادارے کی طرف سے ان کو اٹلی ایک کانفرنس اور سیمینار کی دعوت دی گئی ۔یوں عشرت معین سیما کا سفر شروع ہوا۔اس سفرنامہ میں انھوں نے اٹلی کی جغرافیائی حالت ،تاریخ اور تہذیب پر تفصیل سے لکھا ہے ۔ وہ اٹلی کی ترقی دیکھ کر اس کا مقابلہ اپنے ملک سے بھی کرتی ہیں ۔ یہ ان کا جذباتی پہلو ہے ۔اس کے علاوہ قدرتی خوبصورتی اور لوگوں کے رہن سہن پر بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے کئی اہم مقامات کی تصویریں بھی اس سفرنامہ میں شامل کی ہیں ۔ باقی سفرنامہ کے تمام واقعات کا ایک دوسرے سے ربط برقرار ہے ۔قاری کو کہیں بھی الجھن محسوس نہیں ہوتی۔

لالی چودھری کا تعلق پاکستان سے ہے۔وہ صحافی بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی ۔انھوں نے اپنی زندگی میں کئی اسفار کیے ہیں اور ان پر سفرنامے بھی تحریر کیے ۔2018 میں ڈاکٹر رفیعہ سلیم نے ان کے تیرہ سفرناموں کو یکجا کر کے "لالی چودھری کے سفرنامے" کے عنوان سے شائع کردیا۔

یہ وہ سفرنامے تھے جو شائع ہوتے ہی مشہور ہوگئے ۔ان میں سے بعض سفرنامے ایسے بھی تھے جو پہلے کسی رسالے یا اخبار کا حصہ بنے اور پھر کتابی شکل میں شائع ہوئے ۔ان کے علاوہ خواتین کے لکھے چند اور بھی سفرنامے ہیں مگر ان کی تعداد پانچ چھ سے اوپر نہ ہوگی۔مگر ابھی تک ان کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ان کو عام قارئین تک پہنچا سکے ۔ بہرحال اکیسویں صدی میں خواتین نے کئی سفرنامے لکھے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والے وقت میں مزید خواتین اس میدان میں داخل ہوں گی۔

Mohd Arshad Kasana

Ph.D Scholar

Dept. of Urdu

Delhi University

Delhi-110007

shaadkassana33@gmail.com

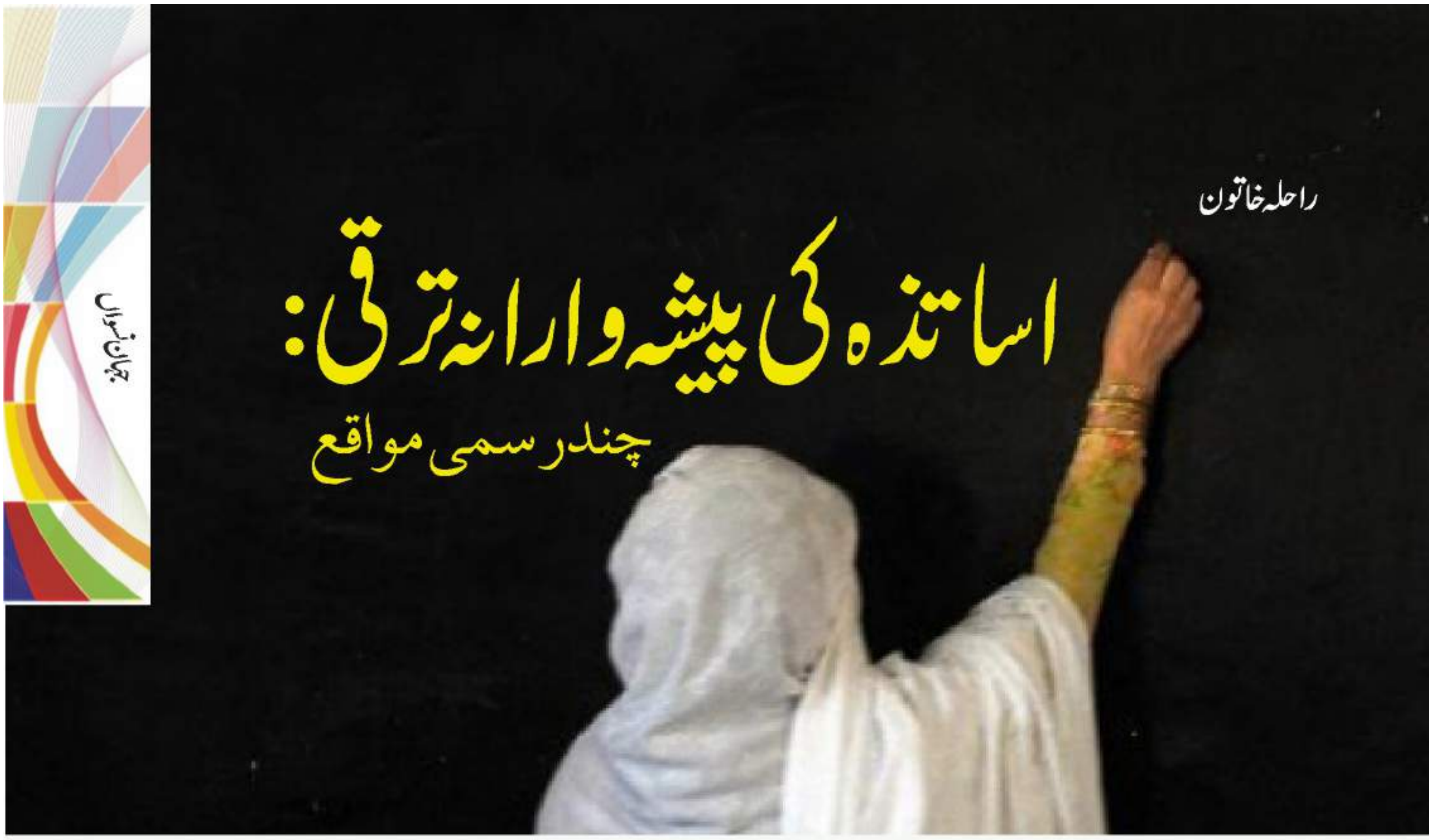

راحلہ خاتون

اساتذہ کی پیشہ وارانہ ترقی: چندر سمی مواقع

انسان کی ضروریات گوناں گوں ہیں۔ لیکن عقل وفکر اور اظہار بیان کی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے، علم وآگہی کا حصول اس کی اہم ترین لازمی ضرورت ہے، اس لیے دنیا کی ہر قوم میں تعلیم کو اہمیت کا مقام حاصل ہے چنانچہ ابتدائی مرحلہ سے لیے منتہی درجات تک کی تعلیم کا ایک مربوط نظام تمام اقوام عالم میں رائج ہے۔

تعلیم کے مطلوبہ مقاصد میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے نظام تعلیم کے مختلف اجزا میں تزئین وتحسین کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ چونکہ معلمین اور اساتذہ اس نظام تعلیم کا سب سے متحرک اور فعال جز ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی تربیت بھی نظام تعلیم ہی کی تزئین وتحسین کا ایک حصہ باور کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر معلمین کو اپنے پیشہ میں مہارت حاصل نہ ہو۔ تو بہتر سے بہتر نظام تعلیم بھی مطلوبہ اور متوقع مقاصد وفوائد کے حصول میں پورے طور پر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگا، اس لیے معلمین کی پیشہ وارانہ مہارت میں اضافہ کے لیے مختلف رسمی اور غیر رسمی سرگرمیاں عمل میں لائی جاتی ہیں، جن میں اساتذہ و معلمین یا جس پیشہ کی سرگرمی ہو پیشہ کے افراد شریک ہوتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں دراصل تعلیمی اجتماعات ہوتی ہیں جو اپنی نوعیت وکیفیت کے لحاظ سے جداگانہ ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۔ کانفرنس، سیمینار، سمپوزیم، ورکشاپ، اورینٹیشن اور ریفرشر کورس وغیرہ ناموں سے موسوم یہ اجتماعات معلمین، اساتذہ، معلم الاساتذہ اور اسکالرس کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی ہیں بشرطیکہ پوری تیاری اور دلچسپی کے ساتھ اس میں شریک ہوں۔ اور ان سے بھرپور استفادہ کے لیے فعال ومتحرک ہوں۔ ان اجتماعات میں جو تقاریر یا مقالات پیش کیے جاتے ہیں وہ موضوع سے متعلق اہم ترین کتابوں کے مطالعہ معلومات ومباحث کا نچوڑ اور تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں پھر مقالہ نگار ان پر جو تبصرہ یا رائے زنی کرتا ہے وہ دیدہ دل کو بڑی روشنی عطا کرتا ہے۔ اگر اس سے بھرپور استفادہ کیا جا تو مختصر وقت میں بڑی گرانقدر معلومات اور فکر ومعانی کے بڑے بے بہا گوہر کا گنجینہ ہمہ دست کیا جا سکتا ہے۔ پیشہ وارانہ ترقی کی سرگرمیاں تحقیق وریسرچ کے طلبا کے فکری سفر کو مزید وسعت فراہم کرتی ہیں اور بقول راویندر ناتھ ٹیگور مسلسل پیشہ وارانہ ترقی کرتے رہنے سے اساتذہ ایسے چراغ بن سکتے ہیں کہ، ایک ہی چراغ سے سو چراغ جل اٹھیں۔

معلمین کی پیشہ وارانہ مہارت میں اضافہ اور ترقی کے لیے جو سرگرمیاں سرانجام پاتی ہیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1) رسمی سرگرمیاں

2) غیر رسمی سرگرمیاں

رسمی سرگرمیاں (Formal activities) وہ ہیں جو معلمین کی پیشہ ورانہ ترقی کی غرض سے ضبط واہتمام کے ساتھ مقررہ وقت پر سرانجام پاتی ہیں۔ ان کی پہلے سے تشہیر ہوتی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شریک ہوسکیں۔

غیر رسمی سرگرمیاں(Informal activities) سے مراد وہ تجربات ومعلومات ہوتی ہیں جو تدریس کے مراحل سے گزرتے ہوئے یا دوسرے اساتذہ و معلمین کے ساتھ تبادلہ خیال کے نتیجہ میں معلمین خود بخود حاصل کرتے ہیں۔

ذیل میں چند رسمی سرگرمیوں جیسے سمینار، کانفرنس، کانگریس، سمپوزیم اور پینلیشن، انڈکشن، اور ریفریشر کورس کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے تاکہ طلبا میں ان کی تعریف وتوصیف سے متعلق جوشکوک وشبہات پائے جاتے ہیں اس کا ازالہ کیا جاسکے۔

کانفرنس(Conference) ایک مجلس بحث ومباحثہ اور محفل غور وفکر ہوتی ہے جہاں اہل دانش وبینش، علما فضلاء، محققین و ریسرچ اسکالرز کسی ایک متعینہ مسئلہ پر غور وفکر کرتے ہیں۔اور بحث ومباحثہ، باہمی تبادلہ خیالات وآراء کے توسط سے کسی حتمی فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔کانفرس سیمینار کی طرح صرف اکیڈمک یا علمی موضوعات پر منحصر نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ ہر شعبہ حیات سے متعلق کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جاسکتا ہے،تجارت،معیشت،سیاست حقوق وواجبات غرض زندگی کے جملہ مسائل ومعاملات کے حوالے سے کانفرنس کا انعقاد کیا جاسکتا ہے۔کانفرنس میں شرکا کی تعداد کم سے کم پچاس ہوتی ہے،، زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں پچاس ہزار بھی ہوسکتے ہیں۔اس کا انعقاد باقاعدہ رسمی طریقہ سے ہوتا ہے اور کانفرنس کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ بیک وقت متعدد مقامات پر منعقد کی جاسکتی ہے۔

سمینار(Seminar) ایک تعلیمی اجلاس اور اجتماع ہے، جو وقفہ وقفہ سے تسلسل کے ساتھ منعقد ہوتا رہتا ہے۔ ہر اجلاس کسی ایک موضوع پر بحث وتمحیص کے لیے مخصوص اور متعین ہوتا ہے۔تمام شرکاء موضوع پر تیار ہوکر آتے ہیں۔اور بحث ومباحثہ، تبادلہ افکار آراء کے ذریعہ موضوع سے متعلق معلومات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اور کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔سیمینار میں شرکاء کی تعداد کانفرنس کے شرکاء کی تعداد سے کم ہوتی ہے۔ یہ کانفرنس کی طرح بہت زیادہ رسمی نہیں ہوتا اور کانفرنس کی طرح بیک وقت متعدد مقامات پر بھی منعقد نہیں ہوتا ہے۔

سمپوزیم(Symposium)

کانفرنس کے طرز پر سمپوزیم بھی محققین، علماء فضلا ،اہل دانش وحکمت، ماہرین علوم وفنون کی مجلس مذاکرہ ہوتی ہے۔اسے اسمال کانفرنس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔جہاں اپنے اپنے موضوع پر اختصاص کی سند رکھنے والے ماہرین تبادلہ خیالات وافکار کے وسیلے سے علم وحکمت کے قیمتی نکات کے وہ گوہر آبدار لٹاتے ہیں کہ عقل وخرد کے تمام دریچے روشن ومنور ہوجاتے ہیں۔اس میں شرکاء کی تعداد کم ہوتی ہے کیونکہ اس میں سامعین کو دعوت نہیں دی جاتی صرف اسکالرز ہی اس میں مدعو ہوتے ہیں۔اگر پندرہ اسکالر کو دعوت دی گئی ہے تو صرف پندرہ اسکالر ہی اس کے شرکاء ہوتے ہیں۔ایک اسکالر اپنے آراء کو پیش کررہا ہوتا ہے تو دوسرے اسکالر اسے غور سے سنتے ہیں پھر اس پر بحث ومباحثہ ہوتا ہے۔

کانگریس(Congress) مختلف حکومتوں اور معاشروں کے نمائندوں کی مجلس مذاکرہ ہے جہاں یکساں دلچسپی رکھنے والے افراد مشترکہ موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں اور مشترکہ مفادات کے تحفظ، اس کی حصولیابی کی تسہیل وتنظیم باہمی تصادم سے بچنے کی تدابیر واقدامات پر غور ہوتا ہے۔ چونکہ مشترکہ مفادات میں باہمی کشمکش آسانی سے راہ پالیتی ہے اس لیے اس کے مقاصد واہداف میں بڑا تنوع ہوتا ہے اور یہ متعدد ایام تک جاری رہتی ہے۔

ورکشاپ (workshop) دراصل عملی تربیت کی ایک کارگاہ ہوتی ہے،جس میں مختلف ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور ان کی مہارت کے نمونوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔جن ماہرین کو مدعو کیا جاتا ہے وہ اپنے تجربات اور مہارت کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ان نمونوں سے پیچیدہ گتھیاں سلجھتی ہیں اور شرکاء کو اس فن سے عہدہ برآ ہونے کی نئی نئی راہیں معلوم ہوتی ہیں۔ورکشاپ عموماً تین دن تک جاری رہتا ہے کبھی کبھی پورے ہفتے پر مشتمل ہوتا ہے۔

اورینٹیشن (Orientation) ہر تعلیمی ادارے کی علمی تہذیب و ثقافت یکساں نہیں ہوتی، اس لیے ہر نو وارد نئے ماحول سے اجنبیت محسوس کرتا ہے اس اجنبیت کو دور کرنے اور نئے ماحول سے روشناس اور ناموس کرنے کے لیے اورینٹیشن کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس کے بغیر تدریسی واجبات و فرائض اور وہ طلبا میں ترسیل درس کا حق کما حقہ ادا نہیں کر سکے گا اسی لیے ہر جگہ نئے کارکنان کو نئے ماحول سے ہم آہنگ بنانے کے لیے اورینٹیشن کا اہتمام لازماً کیا جاتا ہے۔

انڈکشن (Induction) انڈکشن اور اور ینٹشن ہم مقصد اور ہم معنی ہیں۔ بس فرق یہ ہے انڈکشن اورینٹیشن سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ اس میں نو تقرر اساتذہ کے لیے تقرری کے فوراً بعد انڈکشن پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ انڈکشن کی مدت اورینٹیشن کے مقابلہ میں مختصر ہوتی ہے۔

ریفریشر کورس (Refresher course) یہ بھی ورکشاپ کی طرح ایک تربیتی لائحہ عمل ہے جو قدیم و جدید معلمین و اساتذہ یا کسی تنظیم و جمعیت کے کارکنان کی صلاحیت و استعداد میں اضافہ کرنے اور ان کی کارکردگی کو زیادہ بہتر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس میں عموماً اس نئی تکنیک سے روشناس کیا جاتا ہے جو تغیرات زمانہ اور حالات و ظروف کی تبدیلی کے تحت تمام شعبہ زندگی میں رونما ہوتی ہے اور کہنہ و فرسودہ طریقۂ کار کی افادیت کی معنویت مدہم یا مضمحل ہو جاتی ہے۔ انٹرنیٹ کے زیر اثر حالات کے تغیر کی رفتار بہت تیز ہوتی جا رہی ہے اس لیے نصاب تعلیم کے موضوع اور مواد میں نو بہ نو تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں ان کی تدریس کے طریقے فرسودہ ہو چکے ہیں، اس لیے معلمین کو نئے طریقۂ تدریس سے روشناس کرنا اور اس کی عملی مشق و ممارست کے لیے ریفریشر کورس تربیتی اجتماعات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تاکہ معلمین جدید مواد اور موضوع سے واقفیت حاصل کر سکیں اور طریقہ تدریس کی جدید کاری سے بھی آگاہ ہوں۔

معلمین کی پیشہ وارانہ ترقی میں معاون مذکورہ رسمی سرگرمیاں در اصل تعلیمی اجتماعات ہوتی ہیں لیکن اپنی نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے جداگانہ ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور ہر ایک کی اپنی الگ خصوصیات ہوتی ہیں۔ سیمینار اکیڈمک ہوتا ہے جبکہ کانفرنس کا تعلق ہر شعبہ حیات سے متعلق ہوتا ہے، کانفرنس کے طرز پر سمپوزیم کا انعقاد ہوتا ہے جسے اسمال کانفرنس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ کانگریس میں یکساں دلچسپی رکھنے والے افراد مشترکہ موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ ورکشاپ مہارتوں کی نشوونما کے لیے ایک عملی اور تربیتی پروگرام ہے، اورینٹیشن نئے ملازمین کو کام کے ماحول سے متعارف کرانے کا عمل ہے اور ریفریشر کورس کا مقصد درکار نئی مہارتوں طریقوں اور عمل سے واقف کرانا ہے۔ اس طرح سے اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی کی ان رسمی سرگرمیوں کے مواقع اساتذہ کی صلاحیت و استعداد میں اضافہ کرنے میں اہم کردار نبھاتے ہیں۔

کتابیات:

Lokman, A).2012.(Teacher Education.

Gupta, M. D).2016.(Teacher Education in India and Global Perspective. Agra, Rakhi Parkashan Pra.li.12A, Raman Tower, Sanjay place

Concept of Teacher Education. Retrieved http//:archive.mu.ac.in/myweb_test/ma%20edu/ Teacher%20Education%20%-20IV.pdf

James Matthew Alston(28February 2019.(What's the difference between a conference, a seminar, a workshop and a symposium, Retrieved from https//:conferencemonkey.org/-1075915

https//:en.m.wikipedia.org/wiki/Conference

https//:en.m.wikipedia.org/wiki/Symposium

https//:en.m.wikipedia.org/wiki/Workshop

https//:keydifferences.com/difference-between-induction-and-orientation.html

https//:pediaa-com.cdn.ampproject.org

https//:www.slideshare.net/mobile/FazilAfghan/conference-and-seminar-also-what-is-the-difference-between-conference-and-seminar

The Professional Development of Teachers. 2009.(Retrieved https//:www.oecd.org/berlin/43541636.pdf

https//:unacademy.com/user/talvirdhiman-13

http//:www.differencebetween.net/language/difference-between-conference-and-seminar/

https//:www.researchgate.net/post/How_do_we distinguish_seminar_from_conference_symposium workshop_and_the_like

□□□

Rahela Khatoon

Ph.d Research Scholer, Department of Education and Training

MANUU

Hyderabad-500032 (Telangana)

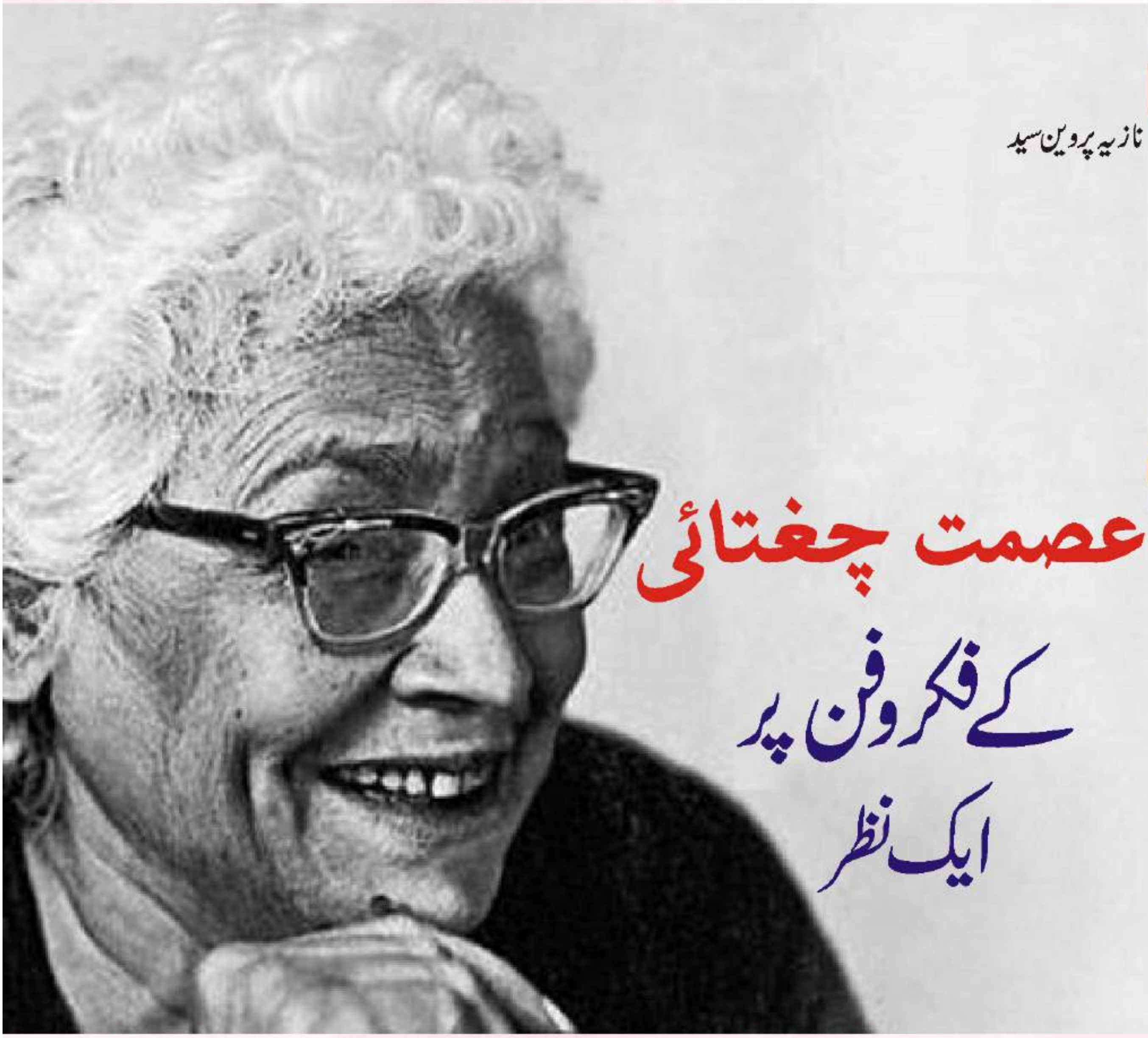

نازیہ پروین سید

عصمت چغتائی
کے فکروفن پر ایک نظر

عصمت چغتائی کا شمار اردو کی مشہور ومعروف ناول نگار، افسانہ نگار، خاکہ نگار اور فلم نگار شخصیات میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ترقی پسند ادیبوں میں عصمت چغتائی ایک اہم اور قابلِ تعریف نام ہے۔ انھوں نے متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی اور ان کے نفسیاتی مطالعے کو اپنی اپنی افسانہ نگاری کا محور بنایا۔ عصمت عورت کی نفسیاتی نشو ونما اور اس کے پیچ وخم کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس میں رمزیت اور طنزیہ انداز ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا وصف ان کا اسلوب ہے۔ عصمت اردو میں جو طرزِ تحریر اور موضوعات ومسائل لے کر آئیں وہ ایک نئے عنوان کی چیز تھی۔ اردو زبان نہ صرف ہندستانی تہذیب وثقافت کی نمائندہ زبان رہی ہے بلکہ ملک کی تمام تحریکات ورجحانات میں بھی اس زبان کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ بیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک کے سفر میں اردو زبان وادب نے خود کو نہ صرف یہ کہ زبان کی سطح پر مضبوط کیا ہے بلکہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ایک زندہ اور جدید زبان کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔ بیسویں صدی میں اردو زبان ایک ایسی شاہراہ پر کھڑی ہے جہاں وہ جدید علم اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی۔

عصمت چغتائی نے متوسط اور ادنی مسلم گھرانوں کی زندگیوں اور ان کے گردوپیش کو ایک تصویر کے دورخ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے گردوپیش سے ان کے طرزِ زندگی، ان کی بودوباش اور ان کی اقتصادی حالتوں کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اشتراکی سیاست کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک بھی تعطل اور انتشار میں مبتلا ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ نظام، سماجی نابرابری اور غریبوں اور محنت کشوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے والے قلمکار مایوس ہوگئے نیز حلقہ اربابِ ذوق سے منسلک قلمکار زیادہ توانائی اور آزادی کے ساتھ اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔

عصمت چغتائی نے انگارے کی افسانہ نگار رشید جہاں کی نسوانی بغاوت کو وسعت بخشی۔ انھوں نے متوسط مسلم گھرانوں کے معاملات اور بالخصوص جنس نگاری کا سہارا لے کر معاشرے کی نسوانی حقیقت کو سچائی کے ساتھ بے نقاب کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ عصمت عورت کی مشاہدہ بین ہیں اور وہ اس حقیقت کا اظہار کر کے اس پر ہونے والے مظالم کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اس غلط رسم ورواج کی بھی اصلاح کرنا چاہتی ہیں جو کہ مسلمان عورتوں میں رواج پا چکی ہیں۔ عصمت کے افسانوں میں لحاف، چوتھی کا جوڑا، گیندا، فسادی، دوہاتھ، بے کار، بہو بیٹیاں، پردے کے پیچھے، بچھو پھوپھی، ننھی کی نانی، ڈائن، ساس، اف یہ بچے، پیشہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ زبان کی دلکشی بھی عصمت کی کامیابی کا راز ہے۔ انھیں عورتوں کی زبان پر مہارت حاصل ہے۔

علم وادب کی ترقی میں ترقی پسند ادیبوں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس تحریک نے اردو شعرو ادب پر بڑے گہرے اور دیر پا اثرات مرتب کیے۔ اردو ادب کو مغربی علوم وفنون سے فیض یاب کرنے میں اس تحریک کے ادیبوں نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

عصمت نے اپنی تصانیف میں صرف منظر کشی نہیں کی ہے بلکہ زندگی کو پیش کیا ہے۔ عصمت جو ماحول پیش کرتی ہیں اس کا تعلق صرف اپنے اسلوب کی انفرادیت کو نمایاں کرنا نہیں ہوتا۔ یہ ماحول کردار اور ایک خاص طبقے کی نفسیات اور اس کی جذباتی حالتوں کی کئی باریک گرہوں کا مظہر اور نمائندہ بن جاتا ہے۔

انسانی زندگی کے گونا گوں تجربات، مشاہدات اور مسائل کو مختلف ادیبوں اور فن کاروں نے اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے لیکن عصمت چغتائی کی بے باکی اور حق گوئی کا کوئی ثانی نہیں۔ اردو فکشن میں عورتوں کے مسائل، ان کے احساسات کی ترجمانی پر بہت لکھا گیا ہے۔ لیکن جب ایک خاتون فکشن نگار عورتوں سے متعلق لکھتی ہے تو وہ ان کے جذبات واحساسات کو محسوس کرتے ہوئے لکھتی ہے۔ جس کے اظہار میں زبان بنیادی رول ادا کرتی ہے۔

عصمت کے یہاں یہ زبان دست بستہ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اسے جس سانچے میں چاہتی ہیں، ڈھال دیتی ہیں۔ عصمت کی تحریروں میں بلا کی روانی، برجستگی اور بے باکی ہے۔ اس روانی کی وجہ سے کبھی کبھی زبان میں تیزی، تندی اور کھردرا پن محسوس ہونے لگتا ہے۔

عصمت چغتائی کا اصلی نام عصمت خانم چغتائی تھا۔ لیکن ادبی دنیا میں وہ عصمت چغتائی کے نام سے مشہور معروف ہوئیں اور یہی ان کا قلمی نام ہے۔ ان کے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا شمار بھی بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کا خاندان تعلیم یافتہ تھا جہاں لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ عصمت چغتائی کو علم وفن کی دولت وراثت میں ملی تھی۔ انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ یہی شوق انھیں بعد میں مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار بنانے میں معاون ثابت ہوا۔

اردو افسانے میں عصمت چغتائی نے خواتین اور ایسے جڑے مسائل پر بہت لکھا۔ ان کے افسانے اور ناول متوسط طبقے کی خواتین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اردو میں عصمت کا پہلا افسانہ 'گیندا' ہے۔ یہ افسانہ کئی اہم موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار گیندا ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کی سہیلی ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ کہانی اسی لڑکی کی زبانی سنائی جاتی ہے۔ دونوں بچپن میں ساتھ کھیلتی ہیں۔ گیندا کی بچپن میں ہی شادی ہو جاتی ہے اور بعد میں وہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ کھیل کے دوران جب گیندا کو سیندور دیا جاتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ''بدھوا کا ہے کو سنگار کرے'' گیندا کی سہیلی کا بھائی گیندا کو ماں بنا دیتا ہے۔ کسی طرح لڑکے کو دہلی بھیج دیا جاتا ہے۔ سال ڈیڑھ سال بعد گیندا کی سہیلی واپس آتی ہے تو گیندا کی گود میں بچہ ہوتا ہے۔

عصمت چغتائی ترقی پسند ادب سے وابستہ تھیں۔ جب ہم ترقی پسند ادب کہتے ہیں تو اس کی وسعت لامحدود ہے۔ قصہ، کہانی، ناول، غزل، نظم غرض کہ ہر فکر وعمل کے کارہائے نمایاں جن سے انسان کی فلاح و بہبود مقصود ہو وہی دراصل ترقی پسند ادب ہے۔ عصمت چغتائی کا شمار اردو کے مشہور ومعروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ عصمت اپنے افسانوں میں موضوع کو خاص اہمیت دیتی ہیں۔ اور اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں لڑکیوں کی ذہنی کیفیات، اندازِ گفتگو، خیالات اور ہنسی مذاق کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھونے لڑکیوں کی نفسیاتی کیفیات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ عصمت نے گھریلو زندگی کے علاوہ ہندو مسلم، زمین داری، مذہب، سیاست، وغیرہ کی بھی خوب صورت تصاویر اپنے افسانوں میں پیش کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عصمت کا مشاہدہ گہرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار کی زندگی کے تمام پیچ وخم ان کے اوپر روز روشن کی طرح صاف تھے اور بہ آسانی ان کے قلم کی گرفت میں آتے تھے۔ خود عصمت کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں انھیں کیفیات کی تصویر کشی کی ہے جو ان کے اپنے تجربات و مشاہدات ہیں۔

عصمت نے ایسے موضوعات پر بھی لکھا جن پر لکھنے والوں کو نخش

نگار کہا جاتا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں پر مقدمہ بازی ہوئی تو عصمت کو بھی ان کے بعض افسانوں کے لیے تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ عصمت چغتائی کا افسانہ 'لحاف' اس کی مثال ہے۔ اس افسانے میں عصمت نے ہم جنسی کو موضوع بنایا ہے۔ لحاف سے جنسی لذت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ سماج میں موجود برائی کو اس طرح ظاہر کیا ہے جس طرح ایک ڈاکٹر مریض کے مرض کو دریافت کرتا ہے اور اس کا علاج بتایا ہے۔ عریانیت سے بچتے ہوئے عصمت نے اس افسانے کو مکمل کیا ہے۔ عصمت نے 'آدھی عورت آدھا خواب' میں عورت کے مختلف روپ کو پیش کیا ہے۔ افسانہ 'اپنا خون' میں بھی عورت پر مظالم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ عصمت نے 'اف یہ بچے' اور دسرے افسانوں میں خواتین اپنے مختلف مسائل کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ افسانہ 'چھوٹی آپا' میں عصمت نے ایک پڑھی لکھی ہندوستانی خاتون کی کہانی پیش کی ہے۔ افسانے میں عصمت چھوٹی آپا کے پرانے خطوط کے بارے میں لکھتی ہیں:

"کون نہیں جانتا کہ چوری بری ہوتی ہے پر بعض چوریاں
ایسی مزیدار ہوتی ہیں کہ نیت بھٹک ہی جاتی ہے۔ پوشیدہ
خطوط، پرانی کتابیں، اور کاپیاں اور ہزاروں ڈھکی چھپی
چیزیں جنھیں لوگ کپڑوں کی تہوں کے نیچے چھپا کر رکھتے ہیں
یہ چیزیں یہ ہاتھ لگ جائیں تو پھر کیا کہنے!۔"

عصمت نے بہت سی ڈھکی چھپی باتوں کو اجاگر کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ ان افسانہ کا 'خدمت گار' میں بہت سی باتوں کو مکالموں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ 'عورت' میں عورت کے حوالے سے مختلف رائے کو ظاہر کیا ہے۔ ایک اقتباس اس طرح ہے:

عورت ... عورت ... عورت ... بڑی اچھی، بے وفا، باوفا، ایسی ویسی اور خدا معلوم کیسی کیسی۔ ہر دور، ہر ملک اور ہر زمانے میں مفکروں اور ادیبوں نے خواتین کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور پیش کی ہے۔ کوئی شاعر اس کے حسن پر زور دے رہے ہیں تو کوئی اس کی پارسائی اور نیک سیرتی پر مصر ہیں۔ ایک مفکر کا خیال ہے 'خدا کے بعد عورت کا مرتبہ ہے' تو دوسرے اسے 'شیطان کی خالہ' بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک جناب فرماتے ہیں ایک دھوکے باز مرد سے ایک دھوکے باز عورت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ ایک کالے مرد سے ایک کالی عورت زیادہ کالی ہوتی ہے کس قدر شاندار بات کہی ہے، کہ بس جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے اور اگر میں خود عورت نہ ہوتی اور ان اقوال نے مجھے بوکھلا نہ دیا ہوتا تو کہنے والے کا منہ چوم لیتی مصیبت تو یہ ہے کہ ان نامعقول مقولوں نے سٹی گم کر رکھی ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جتنا مردوں نے عورت کو سمجھنے کا دعوی کیا ہے اتنا عورتوں نے مردوں کے متعلق کبھی کوئی قول اپنی عقل سے نہیں بنایا۔ مردوں نے کہا 'مرد ظالم ہوتا ہے' وہ چپ چاپ ظلم سہنے لگیں۔ مردوں نے کہا 'عورت ڈرپوک ہوتی ہے' وہ چوہیا تک سے ڈرنے لگیں۔ پھر فرمایا 'وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل گئیں'۔

عصمت نے افسانوں میں سماج میں پھیلی برائیوں پر شدید چوٹیں کی ہے۔ عصمت نے سماج کے تاریک پہلوؤں کو جس پر عام آدمی کی نگاہیں نہیں پڑتی ہیں انھیں بھی پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھیں معاشرے کے اندر جو خامیاں اور لوگوں کی جو نفسیاتی پیچیدگیاں نظر آئیں اس کو بڑی چابک دستی سے اپنے افسانوں میں سمو دیا ہے۔ عصمت جب بڑی ہوئی اور باضابطہ لکھنے پڑھنے لگیں تو انھیں ترقی پسند تحریک کے ادیبوں کے خیالات نے کافی متاثر کیا جس نے ان کے اظہارِ بیان کو جلا بخشی۔ ان کی اس طرح آزاد خیالی کی بنا پر ان پر فحاشی کا الزام بھی لگا۔

عصمت چغتائی کے افسانوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ان کے منفرد اسلوب اور طرزِ نگارش نے ان کے افسانوں میں خوب صورتی پیدا کر دی ہے۔ عصمت نے عام فہم، آسان، سلیس اور عورتوں کی بوچال کی زبان استعمال کر کے اپنے افسانوں میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ 'چوتھی کا جوڑا' عصمت کا نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ ایک غریب بیوہ بی اماں کے خاندان کی کہانی ہے جو دو بیٹیوں کی کفالت کرتی ہے۔ کبریٰ بڑی لڑکی ہے جس کی عمر کافی ہو چکی ہے اور اس کی شادی کی فکر میں وہ گھلی جا رہی ہیں۔ چھوٹی بیٹی حمیدہ ہے۔ زری اور کترن کے کام میں بی اماں بہت زیادہ ماہر تھی اور محلے کی عورتیں جن کپڑوں میں مکمل سلائی نہ ہوتی وہ لا کر بی اماں کے حوالہ کر دیتی اور وہ اس طرح سے کترن کرتی کہ کپڑا برابر ہو جاتا۔

عصمت نے اپنے مشہور افسانہ "چوتھی کا جوڑا" میں تقسیم ہند کے بعد متوسط مسلم معاشرے کی بیٹیوں کی شادی کا مسئلہ پیش کیا ہے۔ اس میں یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ وسائل کی کمی کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی تو ماں باپ کی حالت کیسی ہو جاتی۔ لڑکیاں کس طرح کی ذہنی کیفیتوں اور انفسیاتی اُلجھنوں کی شکار ہو جاتی ہیں۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے عصمت نے اس افسانے میں عورتوں کی زبان، محاورے اور خیالات کی جو کامیاب پیش کش کی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ یہ افسانہ موضوع کے اعتبار سے جتنا دلچسپ اور قابلِ قدر ہے اتنا ہی عصمت کی فن کارانہ مہارت کا آئینہ بھی ہے۔ یہ افسانہ جہاں مسلم متوسط طبقہ کی لڑکیوں کے شادی بیاہ کے مسائل کو بڑے موثر اور

فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کرتا ہے وہیں ان مفاد پرستوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے جو سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور اپنی اجارہ داری کے ذریعہ سماج میں اپنا مقام بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور جہیز جیسی سماجی لعنت کو فروغ دے رہے ہیں۔

عصمت چغتائی کے کردار بھی اپنے اپنے مقام پر مناسب ترتیب اور عمل کے ساتھ فطری انداز کے معلوم ہوتے ہیں۔انھوں نے کرداروں کے درمیان جو مکالمے ادا کیے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔ان کے مکالمے چھوٹے چھوٹے جملوں پر مبنی ہوتے ہیں اور حسب ضرورت وہ طنز و ظرافت سے بھی کام لیتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ طویل اور لمبی باتوں کو بھی وہ کفایت لفظی کے ساتھ طنزیہ انداز میں ایک یا چند جملوں میں بیان کر دیتی ہیں۔ان کے طنزیہ اور ظریفانہ جملے اور فقرے بالکل ترشے ہوئے ہوتے ہیں۔انھوں نے جس فن کارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ انھیں اردو زبان و ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔

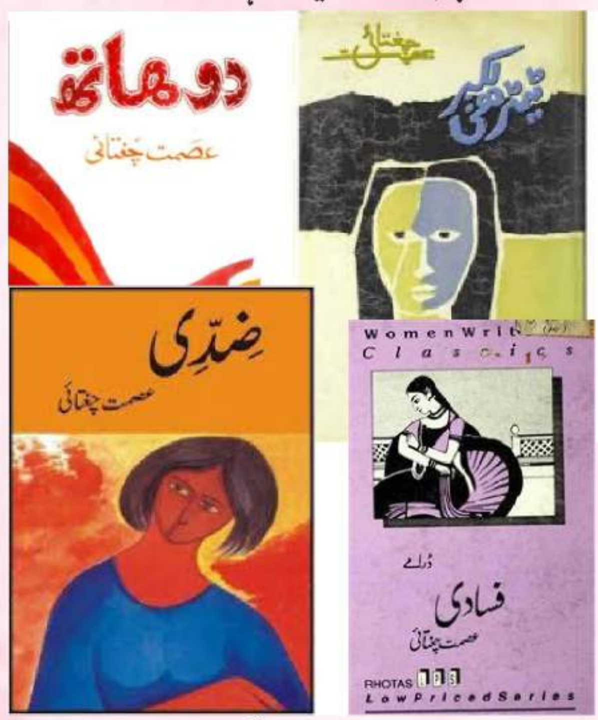

عصمت نے جس دور میں افسانہ لکھنا شروع کیا تھا اس دور میں تعلیمِ نسواں کا رواج بہت کم تھا۔عورتوں میں پردے کی پابندیاں انتہا پر تھی وہ گھر کی چہار دیواری تک محدود تھیں،لہٰذا ایسے حالات میں ان کے احساسات کی حقیقی ترجمانی کرنا بڑی بات تھی۔عصمت نے ان چہار دیواریوں کے اندر کی دم توڑتی خواہشات اور ان کی زندگیوں کو قریب سے دیکھا اور جو محسوس کیا انھیں اپنے افسانوں کا موضوع بنالیا۔گو کہ سماج کی عائد پابندیوں سے انحراف بہ ظاہر ناممکن تھا، اور سماج کے ان تاریک پہلوؤں کو روشنی میں لانا بڑی جرأت کی بات تھی۔عصمت پہلی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ان موضوعات کو بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہی حقیقت نگاری ان کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

عصمت چغتائی نے افسانوں میں عورت اور اس سے متعلق مسائل کو نہ صرف سمجھا بلکہ ان مسائل کو افسانوں میں پیش بھی کیا ہے۔ افسانوں کے موضوعات کے علاوہ افسانوں کے عنوان بھی عورت کے مختلف روپ کو اجاگر کرتے ہیں۔ 'کنواری'، 'گیندا'، 'دلہن'، 'ڈائن' اور بھی بہت سے افسانے ہیں جن کے عنوان خاتون کے نام پر ہیں یا خواتین سے متعلق ہیں۔ انھوں نے افسانوں میں بول چال کی زبان استعمال کر کے افسانے کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔ان کے اندازِ بیان میں شیرینی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری کے بہترین نمونے ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔

کتابیات/ مراجع/حوالے

(1)عصمت چغتائیؒ نقد کی کسوٹی پر، ڈاکٹر جمیل اختر
(2)عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول، پروفیسر عبدالسلام
(3)عصمت چغتائی شخصیت اور فن، جگدیش چندر وردھان
(4)اردو افسانہ روایت اور مسائل، گوپی چند نارنگ
(5)عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو
(6)ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، صادق
(7)عصمت چغتائی کا فن، پروفیسر گوپی چند نارنگ
(8)کلیاتِ عصمت چغتائی -ڈاکٹر فرزانہ اسلم
(9)تلاشِ فکر و فن، پروفیسر حدیث انصاری
(10)بیسویں صدی کے اردو شعر و ادب پر سر سید تحریک کے اثرات -ڈاکٹر سید فیروز علی
(11)مولانا حالی اور شبلی کا فکری شعور ایک تقابلی مطالعہ-ڈاکٹر حلیمہ بانو
(12) فراق اور فیض کے فکر و فن کا موازنہ-ڈاکٹر بنٹی فرید علی سید

□□□

Naziya Parveen Saiyad
Research Scholar
Department Of Urdu
Mohanlal Sukhadia University
Udaipur-313001 (Rajasthan)

کہانیاں

ناہید طاہر

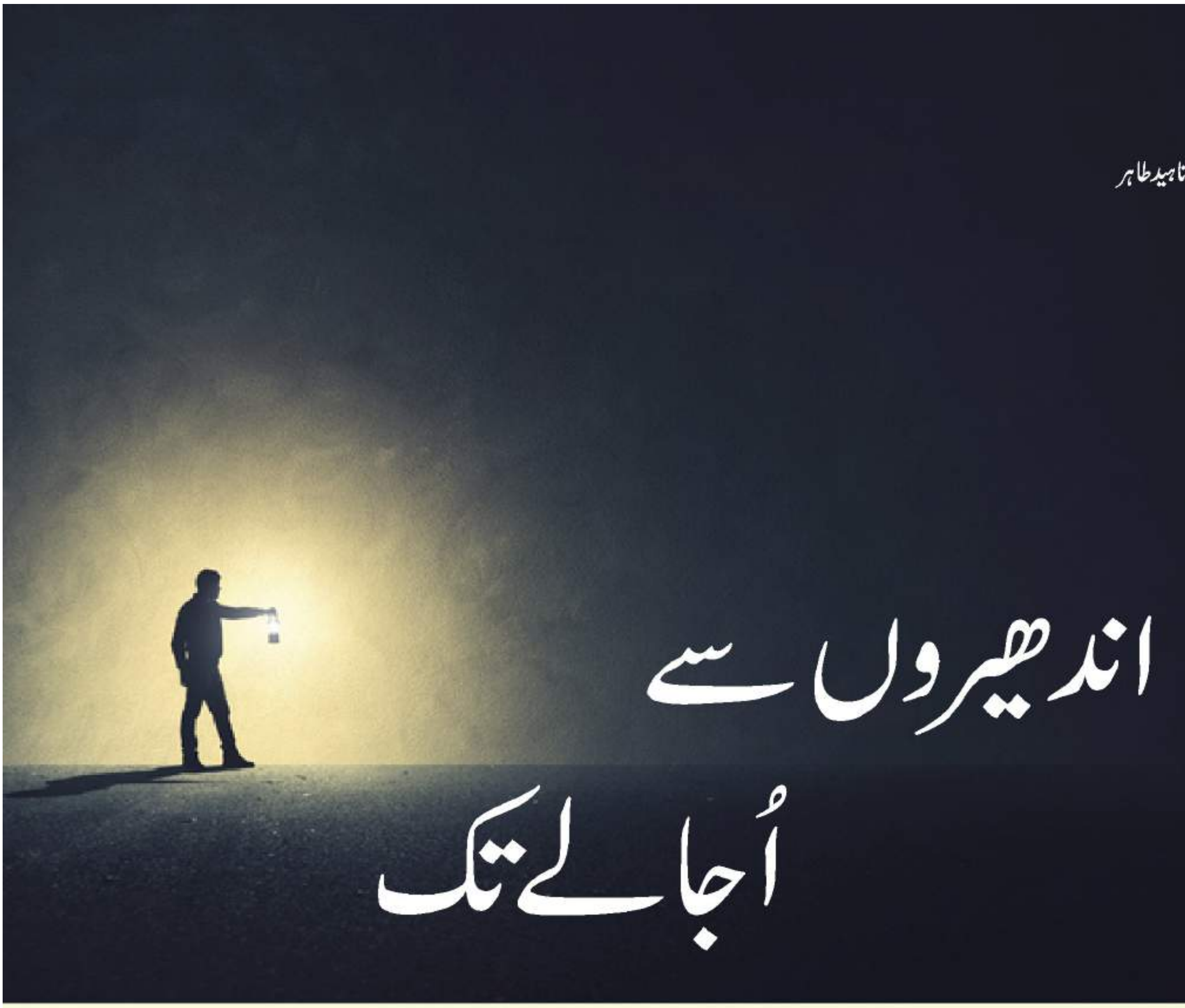

اندھیروں سے اُجالے تک

صائمہ کی کار جوں جوں پہاڑیوں سے نیچے اترتی جا رہی تھی موسم کافی خوشگوار ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف بہار لیے گنگناتی ہوئی ہریالی، خوشنما پھلوں، پھولوں سے لدے ہوئے درخت۔۔۔لہلہاتی ہوئی فصلیں۔۔۔ تروتازہ مویشی اوران دیہاتی لوگوں کے وجود پر چھائی ہوئی طمانیت جوان کی شکلوں پر رقص کناں تھی۔ "بابا۔۔۔! گاؤں کی یہ معطر فضائیں ہمیں گلے لگاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔۔۔!!" صائمہ گہری سانس لیتی سرور آمیز لہجے میں کھلکھلائی۔

"ہاں۔۔۔! خوبصورت رنگوں سے مزین یہ وادیاں کلثوم کی یادوں سے معطر ہیں۔۔!!" افضل شاہ نے پگڈنڈیوں پر نظریں پھیلائے ہوئے اداس لہجے میں جواب دیا۔

عمیر اپنا ہاتھ بیوی کے گیئر لیور پر رکھے ہوئے ہاتھ پر رکھتا گویا ہوا۔

"صائمہ۔۔! ہم نے اپنی منزل پالی۔۔۔۔یہ سب رب العالمین کا کرم اور ماموں جان کی محنت کا نتیجہ ہے۔" افضل شاہ بیٹی، داماد کے چہروں پر چھائی مسرت سے محظوظ ہوتے ہوئے گویا ہوا۔

"خوش رہو۔۔۔تم بچوں نے میرے خوابوں کو تعبیر بخشی ہے۔۔۔!!" افضل شاہ نے تشکر آمیز نگاہوں سے بیٹی، داماد کی بلائیں لی۔

"ماموں جان۔۔۔! آپ نے اس گاؤں کے ایک ایک پتھر کو تراشا ہے، سنگ تراشی ایسی کہ پتھر جی اٹھے ہیں۔۔۔!!"

"الحمدللہ۔۔!!" افضل شاہ کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

صائمہ نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر لی اور پیر بریک پر ٹکا دیے۔ سورج کی کرنیں معدوم ہو چکی تھیں اور بادلوں نے تاریکی کی مہیب چادر رخ پر سجائے گاؤں کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔۔۔۔گاؤں کے اکثر گھروں سے جلتے ہوئے تنور کا اٹھتا دھواں، فضا میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، ان گھروں میں اب مٹی کا دیا نہیں بلکہ بلب روشن تھے، یہ روشنی مٹی کے دیوں سے سبقت لے جاتی ہوئی مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں لوگ گاڑی کے قریب جمع ہونے لگے۔۔۔ولی خان بھی اپنے ناتواں بوڑھے جسم کو لاٹھی کے سہارے گھسیٹتا ہوا گاڑی تک پہنچا۔

"نانا جان۔۔۔!" صائمہ گاڑی سے اتر کر ولی خان کے گلے لگی۔

عمیر نے بھی جھک کر سلام پیش کیا۔ ولی خان نے بچوں کو ڈھیر ساری دعائیں دی، جیسے ہی افضل شاہ پر نظر پڑی ولی خان نے چہرے کا رخ پھیر لیا۔ افضل شاہ نے دیکھا ولی خان کی پیشانی پر ناگواری شکنیں ابھر آئی ہیں۔

"صائمہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے کچھ اہم میل چیک کر رہی تھی۔ عمیر اس کے قریب ہی بیٹھا تھا، افضل شاہ کچھ ہی فاصلے پر چارپائی پر لیٹا ہوا دور آسمان پر چمکتے ستاروں میں ہمیشہ کی طرح کلثوم کو تلاش کر رہا تھا۔ افسوس وہ کہیں نظر نہیں آئی، عمیر ان ہی ستاروں کی چمک اور چاندنی کی نوخیزی میں صائمہ کے رخِ روشن کو بے خودی کے عالم میں نہار رہا تھا، چاند کی عمودی کرنیں اس کے بدن کو بھگو رہی تھیں۔۔۔ دودھیا چاندنی میں اس کا سراپا کسی سنگ مرمر کے حسین مجسمے کی طرح چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔"

اس گاؤں کی پہلی ڈاکٹر جوڑی کا استقبال ہے۔۔۔!! افضل شاہ کی بہن فیروزہ نے بہو بیٹے کو گلے لگاتے ہوئے پرمسرت لہجے میں کہا۔۔۔ افضل شاہ متشکر نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

افضل شاہ نے گاؤں کو جہالت کے اندھیروں سے کھینچ کر علم کے روشن جزیروں میں پہنچایا تھا، یہاں کا ہر بچہ تعلیم سے آراستہ، گاؤں کو ترقی کی راہ پر گامزن، کوشاں دکھائی دیتا، یہاں سب کچھ بدل گیا تھا اگر نہیں بدلا تو صرف ولی خان کی نفرتیں۔۔۔!!!! جو افضل شاہ کے تئیں کسی برف کی طرح منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ افضل شاہ کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا قیمتی اثاثہ یعنی کہ وقت اس گاؤں پر نچھاور کیا تھا قربانی اور محنت کا صلہ اپنوں کی بے اعتنائی، نفرت کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا تھا۔ آج بھی ولی خان کے دل میں زخم تازہ تھے کہ افضل شاہ نے بیٹی کو باپ سے نہ صرف جدا کیا، بلکہ اس کا قاتل بھی ہے۔۔۔!! یہ کیسے ممکن تھا۔۔۔؟ کلثوم تو اس کی جان، اس کی محبت تھی۔۔۔!!

گرم پانی سے غسل اور دیسی گڑ کی چائے نے سفر کی تمام کلفتیں دور کر دی تھیں۔ "کیا واقعی بابا نے مما کا خون کیا۔۔۔؟" شام کے کھانے کے بعد صائمہ گاؤں کی بزرگ دائی اور فیروزہ پھوپھی سے بڑے ہی کرب آمیز لہجے میں استفسار کر رہی تھی۔

"یہ خیال بھی کیونکر آیا۔۔۔۔۔؟" فیروزہ پھوپھی کانپ گئیں اور دائی کے جسم میں خوف کی لہر سی سرایت کر گئی۔

"بابا ہمیشہ کہتے ہیں کہ نانا انھیں گناہ گار سمجھتے ہیں۔۔۔؟" کئی سالوں بعد اس نے اپنے دل کے چھالے نما خدشات کو ادھیڑتے ہوئے سسکاری بھری۔ عمیر بے چینی سے پہلو بدلتا ہوا بیوی کی طرف دیکھنے لگا اور فیروزہ نے دائی کی طرف دیکھا جو ہولے ہولے کانپ رہی تھی کچھ ساعتوں بعد وہ بے پناہ آزردگی سے روتی ہوئی گویا ہوئی۔ "یہ سوچنا بھی گناہ ہوگا۔۔۔!!"

"پھر نانا جان، بابا سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں۔۔۔۔؟"

"افضل شاہ! خونی نہیں۔۔۔ وہ تو اس گاؤں میں ایک مسیحا بن کر آیا تھا۔۔۔!!" دائی نے کہا تو فیروزہ بھی دائی کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بے اختیار رو پڑی۔

صائمہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے کچھ اہم میل چیک کر رہی تھی۔ عمیر اس کے قریب ہی بیٹھا تھا، افضل شاہ کچھ ہی فاصلے پر چارپائی پر لیٹا ہوا دور آسمان پر چمکتے ستاروں میں ہمیشہ کی طرح کلثوم کو تلاش کر رہا تھا۔ افسوس وہ کہیں نظر نہیں آئی، عمیر ان ہی ستاروں کی چمک اور چاندنی کی نوخیزی میں صائمہ کے رخِ روشن کو بے خودی کے عالم میں نہار رہا تھا، چاند کی عمودی کرنیں اس کے بدن کو بھگو رہی تھیں۔۔۔ دودھیا چاندنی میں اس کا سراپا کسی سنگ مرمر کے حسین مجسمے کی طرح چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔

"دنیا کا سب سے حسین مجسمہ ہو۔۔!!!" اس نے سرگوشی بھری تو صائمہ شرما گئی اور بابا کو دیکھتی ہوئی عمیر کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ بہت دور اونچی عمارت پر رنگین قمقموں سے آراستہ اس کے نام کا بورڈ ان سرد مہکتی ہواؤں میں جھومتا نظر آ رہا تھا۔

"میرے خوابوں کی تعبیر۔۔۔!" افضل شاہ بڑبڑایا، گاؤں کا یہ واحد اسپتال تھا جسے گاؤں کی پنچایت نے سرکاری مدد سے تعمیر کروایا تھا۔ صائمہ اور عمیر اپنی ذمہ داریاں بخوبی انجام دے رہے تھے، تین اور ڈاکٹرز، چار نرسوں پر مشتمل اسٹاف تھا"

رات تاریک تھی، لبِ سڑک لائٹ کی زرد روشنی تاریکی کا خاتمہ کرنے کی ناکام کوشش میں کسی بیوہ کی طرح سسکتی نظر آ رہی تھی البتہ آسمان پر روشن تارے کسی شوخ حسینہ کی طرح کھلکھلاتے ہوئے نظر آ رہے

تھے۔۔۔پاس کی گھنی جھاڑیوں سے جگنوؤں کی چمک ایسی لگ رہی تھی جیسے ان جھاڑیوں کو قمقموں سے سجا دیا گیا ہو، گاہے گاہے کیڑوں کی آوازیں تاریکی کو جیسے ہولناک بنانے کی کوشش کررہی تھیں۔صائمہ چارپائی پر لیٹی ہوئی چپ چاپ آسمان کو تکے جارہی تھی۔بابا اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے، فیروزہ بھی بھائی کے قریب ہی بیٹھی تھی، عمیر نائٹ شفٹ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

" نانا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔!! کچھ توقف کے بعد صائمہ دور آسمان پر بکھرے ستاروں کو تکتی ہوئی گویا ہوئی

"سوچ رہا ہوں، کیوں نہ اس گاؤں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوجاؤں، تاکہ تمھارے نانا جان کی اس نفرت کا خاتمہ ہو۔"

" تم چلے جاوگے تو یہ گاؤں کہیں دوبارہ تاریکیوں میں گم نہ ہوجائے۔۔۔"فیروزہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا

" کئی سال پہلے جب میں اپنی پڑھائی مکمل کر کے اس گاؤں میں لوٹا تھا تو ارادوں کی پختگی کے ساتھ ضد بھی ساتھ لے آیا تھا۔۔اس گاؤں کا مقدر بدلنے کی ضد۔!!"

فیروزہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

"جو لوگ رب العالمین کے بندوں کے لیے خیر کا راستہ تلاش کرتے ہیں ۔۔۔ اللہ رب العزت ان کی نسلوں میں خیر منتقل فرمادیتے ہیں، اس کی مثال تم ہو بیٹی۔۔۔!!" صائمہ بے چینی سے پہلو بدلتی ہوئی بابا کی نم آنکھوں کو دیکھنے لگی۔"

نہیں۔۔۔ایسا سوچنا بھی نہیں۔۔۔۔بہت مشکلیں جھیلیں ہیں۔۔۔تم اور کلثوم نے چراغاں کی بتی بن کر ہر روز جلتی ہوئے اجالا پھیلانے کی کوششیں کیں ۔۔اس گاؤں کو روشنی سے ہمکنار کیا ہے ۔۔۔!!افضل شاہ چمکتے تاروں کو ٹکٹی باندھے دیکھتے ہوئے کہا تو صائمہ اٹھ بیٹھی۔

آگے بھی تو سنائیں بابا۔۔۔!!

"کئی سال پہلے جب میں اپنی پڑھائی مکمل کر کے اس گاؤں میں لوٹا تھا تو ارادوں کی پختگی کے ساتھ ضد بھی ساتھ لے آیا تھا۔۔اس گاؤں کا مقدر بدلنے کی ضد۔!!"

فیروزہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

" جولوگ رب العالمین کے بندوں کے لیے خیر کا راستہ تلاش کرتے ہیں ۔۔۔ اللہ رب العزت ان کی نسلوں میں خیر منتقل فرمادیتے ہیں، اس کی مثال تم ہو بیٹی۔۔۔!!" صائمہ بے چینی سے پہلو بدلتی ہوئی بابا کی نم آنکھوں کو دیکھنے لگی۔

" آگے بھی تو سنائیں۔۔۔!!!"

کئی سال پہلے اس گاؤں کا ماحول بڑا عجیب وغریب ہوا کرتا تھا۔یہاں کے بچے، بوڑھے جوان سبھی تعلیم سے نا آشنا، بالکل جاہل تھے۔لوگ زراعت کے پیشے کو پسند کرتے تھے اس طرح ضروریاتِ زندگی بھی مویشیوں کی دیکھ ریکھ سے پوری ہوجاتی تھی۔زندگی میں نہ کوئی ترقی نہ ترقی کے رجحانات۔۔۔!!! پورے گاؤں میں رب کی معصیت اور نافرمانی کا ارتکاب ہورہا تھا۔شام تلے گاؤں پر سناٹوں کی چادر پھیلی دہشت پھیلانے لگتی۔شاخوں پر الو بسیرا کیے رات بھر رویا کرتے، بچے دبک کر ماؤں کی آغوش میں سوتے تو بوڑھے صحن میں بچھائی گئی چارپائیوں پر بیٹھے چلم اور حقے کے کش بھر رہے ہوتے اور گاہے گاہے کھانستے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا کرتے، نوجوان چائے کی دکان اور بس کے ڈھابوں میں بیٹھے گپ شپ میں مشغول کوئی بیڑی سے شغل کرتا تو کوئی مقامی شراب سے بہکنے لگتا تو کوئی چرس وگانجے کا نشہ کرتا۔جب رات گہری ہوتی تو یہ نوجوان لڑکھڑاتے قدموں تلے اپنی جھونپڑیوں کی سمت بڑھ جاتے، نشے کی حالت میں مظلوم عورتوں پر ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑتے ہوئے جیسے مردانگی کا ثبوت پیش کرنے لگتے۔۔۔گالی گلوچ۔۔۔رونا چلانا۔۔۔دبی دبی سسکیاں ۔۔۔گاؤں کا مقدر ان ہی آہوں سے لکھا گیا تھا۔جسے بدلنے کا کسی میں حوصلہ نہیں تھا، بس وسیع چوپال میں مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے اراکین سر جوڑے بیٹھے رہ جاتے۔ولی خان پنچایت کے رکن کے علاوہ گاؤں کا مکھیہ اور ایک امیر ترین شخص تھا۔اس کے کئی کھیت تھے۔لوگ کھیت اور بیلوں کی دیکھ ریکھ کیا کرتے، اس طرح ولی خان کی جانب سے گاؤں کے کئی لوگوں کو روزگار حاصل تھا جس کے سبب گاؤں میں اس کا بہت دبدبہ اور رعب قائم تھا۔

گاؤں میں تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔علم وادب کس چڑیا کا نام ہے یہاں لوگوں کو پتا ہی نہیں تھا۔حیوانات کا ایک ڈاکٹر کرشنا مورتی جو جانوروں کا کم انسانوں کا زیادہ علاج کیا کرتا تھا۔دومولوی اور ایک پنڈت اپنی دکان چلا رہے تھے۔

معصوم لڑکیاں چھوٹے بھائی بہنوں کو گود میں اٹھائے گھر کی رکھوالی کرتیں جب تک کہ ماں اور دادی مٹی کا مٹکا اٹھائے چشمے سے پانی لے نہ آتیں۔ساون کے جھولوں پر بیٹھی کھلکھلاتی دوشیزائیں جن کا مقدر سیاہ تھا۔یہ کہتے ہوئے فیروزہ کی آواز بھرا گئیں۔

"جابر خان ایک ظالم شخص تھا۔۔۔جس سے میری بہن بیاہی گئی تھی۔۔۔" افضل شاہ بہن کے وجود میں چھائی درد کی اذیت محسوس کرتا ہوا بے چین ہوا، دور خلاؤں میں دیکھتا ہوا گرد آمیز ماضی میں جھانکا "جابر خان نے اس رات فیروزہ کو جھونپڑی میں قید کیے بہت پیٹا تھا وجہ صرف اتنی سی تھی کہ فیروزہ نے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ پڑھائی کے ارادے سے میرے چبوترے میں قدم رکھنے کی جرأت کی تھی۔" تین ماہ کی سخت کوششوں کے بعد کسی عورت نے یہ حوصلہ دکھایا تھا۔جس کا حشر اتنا دردناک کے عورتیں سہم کر رہ گئیں۔

"بابا۔۔۔!کیا پورے گاؤں میں صرف آپ نے تعلیم حاصل کی تھی؟" صائمہ نے پہلو بدلتے ہوئے سوال داغا

"اس گاؤں کی تاریخ میں چنندہ لڑکوں نے تعلیم حاصل کی تھی لیکن افسوس تعلیم کی روشنی سے ان کے دماغ چندھیا گئے تھے۔اپنے اردگرد پھیلے غلط عقائد، دیہات میں پھیلی بے راہ روی دیکھ تو رہے تھے لیکن ان میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ انھیں روک سکیں۔گاؤں کو اچھائی کی جانب کھینچ لانے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔بیٹی۔۔! یہ اسی وقت ہوتا ہے جب ہمارے اندر ایمان کی کمزوری حد درجہ بڑھتی جارہی ہوتی ہے تب ہم صرف ایک تماش بین کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔۔۔وہ بھی صرف تماش بین تھے، کسی تقریب یا کسی کی میت پر آتے تو ان کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ، ناک پر رومال، ہاتھوں میں منرل بوتل ہوتی۔میں اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ کے بجائے حقیقت کا چشمہ لگائے۔۔۔ہر صبح گاؤں کا معائنہ کرتا۔۔۔وہاں کے بزرگ اور والدین سے التجا کرتا، تاکہ وہ بچوں کو مدرسہ بھیج سکیں۔

خیر۔۔دوسری صبح زخموں کی کوئی پروا کیے بنا میری بہادر بہن سنسان اور گرد آلود چبوترے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔۔۔اس کے پیچھے ایک من موہنی سی شکل والی لڑکی بھی کھڑی تھی۔۔۔جو مجھے بہت امید بھری نظروں سے دیکھے جارہی تھی۔۔۔یہ کلثوم تھی۔۔!! کئی دنوں تک میں، ان ڈھائی عدد انسانوں کو پڑھاتا رہا۔۔۔سب سے پہلے قرآن کیا کہتا ہے اس بات کو فوکس کیا تاکہ قرآن کی روشنی میں جہالت کے اندھیرے چھٹ سکیں۔۔۔ دھیرے دھیرے گرد و غبار میں اٹے کئی بچے اس چبوترہ نما اسکول میں آنے لگے۔۔میں نے شہر سے اسکول کی اجازت طلب کی تو باقاعدہ ایک چھوٹا سا اسکول بنایا گیا، بچوں کو کتابیں کاپیاں، قلم دوات، تختی وغیرہ ہر چیز سرکار کی جانب سے مہیا کروائی گئی۔۔افسوس لڑکیوں کے تعلق سے ان کی سوچ نہیں بدل سکی، یہاں لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر ماتم کرتے تھے، بیٹی کی پرورش اور اس کی تعلیم و تربیت گویا وقت اور پیسے کا زیاں سمجھا جاتا تھا۔ان کی نظر میں تعلیم نسواں بہت ہی معیوب اور برائیوں کی جڑ تھی۔۔ انھیں اس بات کا قطعی علم نہیں کہ مرد کی تعلیم تو محدود رہتی ہے جبکہ ایک عورت کی تعلیم اس کی کئی نسلوں کو سنوار سکتی ہے بقول ان کے "تعلیم عورت جات کو بگاڑ دیتی ہے۔۔۔عورت گھر کے کام کے لیے بنائی گئی ہے یہ باہر کی ہوا سے میلی ہوسکتی ہے اور آوارہ بھی۔۔۔!!!" میں کہتا "مگر اور سروں پر مٹکیاں اٹھائے دن بھر پنگھٹ پر جاتی ہیں۔۔۔۔گائے بھینسوں کا گوبر اٹھانے پر مجبور ہے۔۔۔کیا تب وہ میلی نہیں ہوتیں۔۔؟ کیا تب ان کی آوارگی کے خدشات نہیں؟؟

مٹکی اٹھانے کے بجائے ہاتھ میں قلم تھامے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکتی ہیں۔۔۔جیسے ٹیچر، ڈاکٹر۔۔۔۔"

"ڈاکٹر نہیں۔۔۔۔بالکل بھی نہیں۔ہمارے گاؤں کی عورتیں بے حیا نہیں۔۔!!!"

اس میں بے حیائی کہاں؟ میں حیران رہ جاتا

"اگر لڑکی کا ڈاکٹر بننا بے حیائی ہے تو پھر اس گاؤں کی عورتوں کا علاج کون کرے گا۔۔۔؟ بچوں کی ولادت کے لیے کیا آپ کسی مرد ڈاکٹر کے پاس جانا پسند کرو گے۔۔۔۔؟" جواب ہوتا۔" ہمارے ڈاکٹر کرشنا مورتی صاب ہیں ناں۔۔۔!!"

"کیا وہ مرد نہیں۔۔۔۔؟"

"بُجروگ (بزرگ) ڈاکٹر ہیں۔۔!!"

"عقل کے ناخن لو۔۔۔۔وہ حیوانات کے ڈاکٹر ہیں۔۔۔۔!!!"

"ڈاکٹر تو ہیں۔۔۔!!"

میں سوچتا۔۔۔بھینس کے آگے بین بجا رہا ہوں۔۔۔۔!!

"ہماری عورتوں کی زچگیاں تو گھروں میں ہوتی ہیں۔۔۔باہر جانے کی کونو جرورت بھی ناہی۔۔۔۔!!!!!!" تب مجھے ایسا محسوس ہوتا بھینس کے آگے بین بجاتا ہوا میرا حلق خون اگلنے لگا ہے۔

کلثوم جو کہ ولی خان کی اکلوتی اولاد تھی۔وہ بہت ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی۔وہ اپنے باپ اور پنچایت سے بغاوت کر کے فیروزہ کے ساتھ پڑھنے آئی تھی۔۔۔ان دونوں نے ایک سال کے اندر اندر گاؤں کے پچھتر فیصد دیہاتیوں کا رجحان پڑھائی کی جانب مبذول کروایا۔۔۔یہ

ایک بہت بڑا انقلاب تھا جس کی وجہ سے گاؤں میں کئی کلثوم اور فیروزہ پیدا ہوئیں۔۔۔ولی خان کی نفرت میرے تئیں بڑھتی ہی جا رہی تھی۔کیونکہ میں گاؤں کے اندھے عقیدوں کو تیزی سے پامال جو کر رہا تھا۔۔کلثوم سے میں شادی کرنا چاہتا تھا لیکن پنچایت اس شادی کے سخت خلاف تھی کیونکہ ولی خان جو اس بیاہ کے خلاف تھا اس کے علاوہ میری مفلسی ولی خان کے مرتبے پر چوٹ تھی۔۔۔ولی خان نے بیٹی کی شادی ایک امیر ترین جاہل دیہاتی سے طے کر دی۔کلثوم نے ایک اور مرتبہ بغاوت کی۔۔۔اس طرح ہماری شادی ہوگئی۔۔۔۔اس بغاوت کا نتیجہ ولی خان میری جان کا دشمن بن بیٹھا۔۔۔نفرتوں کے سائے تلے میں اور کلثوم گاؤں کو گلزار بناتے چلے گئے۔ چند سال بعد جب کلثوم امید سے ہوئی تو ولی خان ہماری خوشیوں میں شامل نہیں تھا۔کلثوم اندرونی خلفشار میں مبتلا بہت خاموش رہنے لگی تھی۔۔۔وہ بہت کم مسکراتی۔۔۔اس کی نگاہیں ہمیشہ اپنے باپ کی راہ تکتی رہتی تھیں۔۔۔ پتا نہیں کون سے غم پال رکھے تھے کہ وہ بیمار بیمار سی رہنے لگی۔کلثوم کے علاج کے لیے میں بہت فکر مند تھا۔اسے شہر لے جایا کرتا تھا۔جب نواں مہینہ شروع ہوا تو ایک رات اس کی اچانک طبیعت بگڑ گئی،دراصل وہ حمام میں گر گئی تھی۔اسے لیبر پین شروع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے مہینے کے آخری ہفتے میں ڈیلیوری ڈیٹ بتائی تھی اور اس دن پہلی تاریخ تھی۔۔۔اتنی جلدی اور اچانک سے درد اٹھا تھا۔۔۔میں بیوی کو لے کر شہر جانا چاہتا تھا۔بیل گاڑی تیار کی اور کلثوم کو اس پر سوار کیا۔کلثوم درد سے بلبلا رہی تھی۔اس دن ولی خان ہمارے گھر پہلی مرتبہ آیا اور کلثوم کو گلے لگایا کلثوم درد بھول گئی۔۔۔اس کے چہرے پر تتلیاں مسکرانے لگیں۔ مجھے شہر جانے سے روک دیا گیا۔کیونکہ گاؤں سے شہر کا فاصلے میں کئی گھنٹوں کی مسافت جو تھی۔۔۔راستے میں گھنا جنگل بھی پڑتا تھا۔۔۔اتنا طویل سفر کلثوم کو اس حالت میں لے جانا واقعی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔میں ماتھا پکڑ کر بیٹھ گیا۔دائی کو گھر بلایا گیا۔ڈاکٹر بھی کچھ ہی دیر میں آ گیا تھا۔

"حیوانات کا ڈاکٹر ڈیلیوری کرے گا۔۔۔؟" میں حیران تھا۔

"وہ تجربے کار ہے اور پھر اسی نے کلثوم کی ماں کی زچگی بھی کی تھی۔۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں۔۔۔! یہ حیوانات کا ڈاکٹر ہے۔۔۔اسے انسانی دوائیاں اور علاج کی کچھ سوجھ بوجھ نہیں !!" میں بے بسی محسوس کرتے ہوئے دبے انداز میں احتجاج کیا۔

"ہمیں علاج نہیں صرف زچگی تو کروانی ہے۔۔۔!!" ولی خان نے لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

اس گاؤں کو لیڈی ڈاکٹر کی سخت ضرورت تھی۔۔۔لیکن اس عرضی کو چوپال میں سبھی نے انا کا مسئلہ بنا کر رد کیا ان میں ولی خان بھی شامل تھا۔کلثوم درد سے نڈھال ہوتی ہوئی بولی ۔۔۔اس کی قوت مدافعت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ اب اس سے سہی سے بیٹھا بھی نہیں جارہا تھا۔۔ سانسیں الجھنے لگی تھیں۔۔۔ دائی نے پانی گرم کرنے کو کہا اور تیز بلیٹ قینچی کے علاوہ ضرورت کی تمام اشیاء منگوائی ۔۔۔دیا کی روشنی میں اس کے ہاتھ چلتے رہے پھر وہ گھبرائی ہوئی باہر آئی۔۔۔کلثوم کی حالت بہت بگڑ گئی۔۔۔مجھے ایسا لگ رہا تھا جاہلوں کے درمیان کھڑا اپنی شہ رگ پر خنجر چلا رہا ہوں۔!!!

اس گاؤں کو لیڈی ڈاکٹر کی سخت ضرورت تھی۔۔۔لیکن اس عرضی کو چوپال میں سبھی نے انا کا مسئلہ بنا کر رد کیا ان میں ولی خان بھی شامل تھا۔کلثوم درد سے نڈھال ہوتی ہوئی بولی ۔۔۔اس کی قوت مدافعت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ اب اس سے سہی سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔۔۔ سانسیں الجھنے لگی تھیں۔۔۔دائی نے پانی گرم کرنے کو کہا اور تیز بلیٹ قینچی کے علاوہ ضرورت کی تمام اشیاء منگوائی۔۔۔دیا کی روشنی میں اس کے ہاتھ چلتے رہے پھر وہ گھبرائی ہوئی باہر آئی۔۔۔کلثوم کی حالت بہت بگڑ گئی۔۔۔مجھے ایسا لگ رہا تھا جاہلوں کے درمیان کھڑا اپنی شہ رگ پر خنجر چلا رہا ہوں۔!!!

"بچہ آڑا ہوگیا ہے۔۔۔ڈاکٹر نے باہر آ کر اطلاع دی تھی۔۔۔ انھیں سیزرین کی سخت ضرورت ہے۔۔۔لیکن ہم کر نہیں سکتے۔۔۔!!!! کیونکہ ہمارے پاس تجربہ،مشین اور آلات کچھ نہیں۔۔!!"

"خدایا رحم۔۔۔۔!" میں لہرا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"کلثوم کی سانسیں چل نہیں رہیں۔!! دائی خوف سے چلائی تو میں غش کھانے لگا۔

"زچگی سے پار لگنا۔۔۔کوئی معمولی بات نا ہی۔۔۔!!!" گاؤں

کی عورتیں غمگین بیٹھیں ایک اور ماں کو موت کے حوالے ہوتے دیکھ کر باتیں کرنے لگی تھیں۔ کیونکہ گاؤں میں آئے دن ڈیلیوری میں اموات ایک عام بات تھی۔

"ڈاکٹر میرے بچے کو بچالو۔۔۔۔" میں تڑپ کر کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے۔

"میں مجبور ہوں۔۔۔۔۔۔!!"

میں خاموش نگاہوں سے کلثوم کو دیکھتا رہا۔۔اس کی آنکھیں جیسے کسی کے انتظار میں کھلی رہ گئی تھیں۔۔۔میں نے دھیرے سے اس کی آنکھوں کو بند کیا، میں ایک سائنس اسٹوڈنٹ تھا، کالج ٹائم میں کئی مرتبہ سیزرین کیسس دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔۔۔میں نے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے سختی سے کپکپاتے ہاتھوں کو بھینچ لیا۔۔۔۔!!

ہوائیں سائیں سائیں کی آواز کرتی ہوئی ماحول پر خوفناک ہولنا کی طاری کیے ہوئے تھی۔بابا کے گھٹنوں پر سر رکھے صائمہ ہچکیاں لیتی رہی۔موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ساڑھے سات بج رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا رات گہری ہو گئی ہو۔

"فون اٹھا لو بیٹی۔۔۔" افضل شاہ اپنے وجود کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا بولا تو صائمہ نے فون پر نظریں دوڑائی، عمیر کی کال تھی۔

"ہیلو۔۔۔!!"

"صائمہ ایمر جنسی ہے۔۔۔تم جلدی سے ہسپتال آجاؤ۔۔۔!!" صائمہ فوراً کھڑی ہوئی، عمیر کو کچھ ہدایتیں بھی دینے لگی کچھ توقف بعد فون بند کرتی ہوئی بابا سے گویا ہوئی۔"بابا! آپ کی ہمت اور حوصلوں کو سلام!!" افضل شاہ کی گیلی آنکھوں میں تبسم کھل اٹھا۔صائمہ نے گاڑی کی چابی اٹھائی راستے میں نانا جان کو پک کیا اور انھیں اپنے ساتھ ہسپتال لے آئی۔۔۔ولی خان حیران کہ اتنی رات کو صائمہ ہسپتال کیوں لے جارہی ہے۔؟

آپریشن تھیٹر تیار تھا۔۔۔ولی خان کمرے کے بالکل کونے میں بیٹھا ہوا صائمہ کو سیزرین کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔۔۔وہ لڑکی بہت مشکل سے سانس لے رہی تھی۔۔۔۔اسے آکسیجن لگایا گیا۔" جلدی کریں۔۔۔۔" صائمہ مضطرب انداز میں کہہ رہی تھی۔۔۔۔لڑکی کو جھکا کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں انجکشن لگایا گیا۔۔۔لڑکی درد سے بلبلا اٹھی۔

ولی خان کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔

"کلثوم۔۔۔!!!!!" ولی خان کے لب تھرا اٹھے۔۔۔سوچ کے جھروکوں سے درد ناک ماضی کپکپاتا ہوا جھانک رہا تھا۔۔۔ولی خان کانپ رہا تھا۔۔۔کلثوم کا سرد ہوتا جسم تیز تیز سانس لے رہا تھا۔۔۔جیسے کوشش کر رہا ہو کہ زندگی کی رمق برقرار رکھ سکے۔۔۔لیکن افسوس وہ ناکام ہوئی۔۔۔موت نے زندگی پر سبقت حاصل کی اس کے چہرے پر بے بسی کی مہیب چادر پھیلا دی۔۔ولی خان نے سوچ کے اس دریچے کو بند کرنا چاہا۔۔۔اس کی آنکھوں کے گوشے دوبارہ سے بھیگنے لگے تھے۔۔۔افضل شاہ کانپتے ہاتھوں سے بلیٹ اٹھا رہا تھا۔۔۔۔۔!!!!!

"افضل شاہ۔۔۔کلثوم میرے جگر کا ٹکڑا ہے" ولی خان کا جسم لرزنے لگا۔موت کے وحشی سناٹوں میں اچانک بچے کے رونے کی آواز گونجی تو اس انہونی پر گاؤں کی عورتیں حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگیں۔۔۔افضل شاہ کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے۔۔۔۔اور ۔۔۔۔کلثوم گہری نیند سو رہی تھی۔۔۔۔!!!!!ولی خان کا سر چکرا گیا۔۔۔آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

صائمہ کے دستانے پہنے ہاتھ خون آلود تھے وہ اس نازک اندام کا کئی آلات کے ذریعے پیٹ چاک کر رہی تھی۔۔۔کچھ ہی سکنڈ بعد معصوم مولود، روتا ہوا کمرے میں موجود سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیرتا چلا گیا۔

ولی خان کا دماغ ماضی میں بھٹک رہا تھا جہاں افضل شاہ بچے کو فضا میں اٹھا کر مضبوط لہجے میں جنونی انداز میں کہہ رہا تھا۔

"گواہ رہیں۔۔!! یہ معصوم بچی۔۔۔ایک دن اس گاؤں کی ڈاکٹر بنے گی اور کسی کلثوم کو بے بسی سے مرنے نہیں دے گی۔۔!!"

ولی خان کے جسم پر مسرت خیز کپکپاہٹ طاری ہوئی وہ پوری قوت سے چلایا۔

"صائمہ۔۔۔! افضل شاہ قاتل نہیں۔۔۔!! وہ تو مسیحا ہے۔۔۔!!!" صائمہ طمانیت سے مسکرائی جاہلت کا اندھیرا تو کبھی کا چھٹ چکا تھا۔۔۔آج۔۔۔برف کی طرح منجمد نفرت نے بھی پگھل کر اپنی ہار تسلیم کر لی تھی۔۔۔!!!

□□□

Nahid tahir

W/O Abu tahir Ahmed

Project manager, Saudi ceramic co.

P. O.Box No#40487

Second industrial city,Alkharj road

RIYADH-11499.K.S.A

کہانیاں

شہناز رحمٰن

وہ آئے گا

خواب میں نیند آتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ پھٹی آنکھوں سے بوسیدہ چھت کو گھورنے لگی۔فریدہ نے پوچھا باجی کیا ہوا؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟

وہ۔۔وہ۔۔۔مسیح۔۔۔

دادی بھی جاگ گئیں۔۔کک۔۔کا ہوا بٹیا؟

دادی وہ مسیح۔۔۔

باجی کیا ہوا مسیح کو۔۔۔

فریدہ !میں بیٹھی مسیح سے باتیں کر رہی تھی کہ نیند کا ایک جھونکا آیا اور میری آنکھ لگ گئی۔اتنے میں وہ غائب ہوگیا۔

بٹیا کا ہوگیا ہے۔۔اتنے سال سے تو مسیح گے کوئی خیر خبر نائی ہے۔تو کہاں سے وو کا دیکھ لیہو؟ دادی نے لاپرواہی سے کہا

لو باجی تم پانی پیو۔اور دادی آپ بھی نا!!!۔۔بس شروع ہو جاتی ہیں۔باجی نے مسیح کو خواب میں دیکھا ہوگا۔اس سے باتیں کرتے کرتے انھیں نیند آ گئی ہوگی۔

روبی اپنی سخت مزاجی یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ بدتمیزی کے لیے پورے خاندان میں مشہور تھی ۔رشتہ دار عورتیں اس کی حرکتوں پر جھنجھلا کر کہتیں کہ ’’اس لڑکی کا کہاں ٹھکانہ لگے گا‘‘۔بچپن سے ہی اس نے کسی کو منھ نہیں لگایا تھا۔دنیا کی ہر اچھی چیز کی خواہش اتنی شدید تھی کہ اسے حاصل کرنے میں جی جان لگا دیتی۔لیکن مجال ہے جو کبھی آسانی سے کسی کے کام آجائے ۔اگر کبھی ایک تنکا ادھر سے ادھر کھسکا بھی دیا تو مہینوں احسان جتاتی ۔اس کی اسی بدمزاجی کی وجہ سے اسکول بدلے جاتے رہے۔آخر کار ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے گھر والوں نے ہار مان لی۔والد کے انتقال کے بعد تو اس کے اور ہی پر نکل آئے ۔بھائی ،بہنوں اور ماں سے ہر وقت الجھتی ۔دادی سے تو گویا خدا واسطے کا بیر ہو۔وہ دوسروں میں نقص نکال کر اپنی برتری ثابت کرنے کی ہمہ وقت کوشش کرتی رہتی ۔اور کوشش کیوں نہ ہوتی پورے گاؤں کی لڑکیاں اس سے سلائی ،کڑھائی ،پینٹنگ اور دیگر گھریلو کام سیکھنے آیا کرتی تھیں۔اس کی ماں کہتیں کہ ’’ہماری امر بیل کو ایک دیوار مل گئی اب یہ بدل جائے گی۔

واقعی کچھ ایسا ہی ہوا۔

لیکن اس کے مزاج میں تبدیلی کی نوعیت ماں کی امیدوں سے ذرا مختلف تھی ۔اس کے ارد گرد لڑکیوں کے ہجوم نے اسے اور زیادہ خود پسند بنا دیا تھا لیکن انھیں میں سے کسی شوخ چنچل نے اس کے دل میں خوبصورت احساسات کے لیے جگہ بھی پیدا کر دی تھی ۔اپنے بھائی کی شادی میں غیر متوقع طور پر وہ اپنی خالہ کی فیملی کی دلجمعی سے آؤ بھگت کر رہی تھی سب سے چھپ چھپا کر بریانی ،چکن کوفتے ،چکن فرائی ،مٹھائیاں ،پھل وغیرہ ان کے سامنے پیش کر رہی تھی ۔رشتہ دار عورتوں کو خوشگوار حیرت کے ساتھ جلن بھی ہو رہی تھی ۔وہ زیر لب کہہ رہی تھیں کہ ’’روبی جیسے پھرنگی ناچ رہی ہے‘‘۔پھوپھی تو خاص طور پر مستقل بھنا رہی تھیں کہ ’’دیکھو کیسے بچھی

جات ہے'' رفتہ رفتہ اس ناز برداری کی وجہ سمجھ میں آنے لگی۔

مسیح ،روبی کا خالہ زاد بھائی تھا۔بچپن سے ہی روبی کی والدہ نے دونوں کی شادی کے خواب دیکھے تھے مگر مناسب وقت کے انتظار میں تھیں۔انھیں کیا معلوم تھا کہ صحیح وقت سے پہلے ہی روبی کے دل میں سات سمندروں کا شور برپا ہو جائے گا۔زندگی کے ہر فیصلے کی طرح اس نے یہاں بھی اپنی من مانی کی۔ہزار منع کرنے کے باوجود سندیسے اور خطوط کا سلسلہ چل نکلا۔بہت عبادت گزار تو وہ پہلے بھی نہ تھی۔مسیح کی توجہ کے بعد تو اس کے دل میں وہ جگہ جو خدا کی محبت کے لیے مختص تھی اس پر بھی مسیح کی حکمرانی ہوگئی۔۔۔کسی آسمانی پھول کی طرح اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔وہ ایسی انہماک سے مسیح کے پیمانوں پر مکمل اترنے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس کے ارد گرد خط تنسیخ کھینچا جا رہا ہے۔

حد تو اس وقت ہوئی جب وہ مسیح کی بہن شبو کی شادی میں شرکت کے لیے گئی اور مستقل تین مہینے وہیں قیام پذیر رہی سارے رشتہ دار یہ دیکھ کر حیران تھے کہ روبی جیسی لڑکی بڑی بڑی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے۔مسیح کی ماں سے خاندان کی عورتیں تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھیں کہ "ارے بہو نہیں، ہیرا ملنے والا ہے ہیرا"۔یہ سب سن کر روبی پھولے نہ سماتی۔

حد تو اس وقت ہوئی جب وہ مسیح کی بہن شبو کی شادی میں شرکت کے لیے گئی اور مستقل تین مہینے وہیں قیام پذیر رہی۔سارے رشتہ دار یہ دیکھ کر حیران تھے کہ روبی جیسی لڑکی بڑی بڑی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہے۔مسیح کی ماں سے خاندان کی عورتیں تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھیں کہ ''ارے بہو نہیں، ہیرا ملنے والا ہے ہیرا''۔یہ سب سن کر روبی پھولے نہ سماتی۔

لیکن اس ہیرے کی قسمت میں چمکنا نہیں تھا۔اسی لیے تو مسیح کی دادی نے بے بنیاد الزام میں اسے ذلیل و خوار کر کے دھتکار دیا تھا۔ٹھوکر کی لذت سے آشنائی ہوئی تو روبی کی زندگی نے ایک نیا موڑ لے لیا۔وہم کی زبان میں بیان ہونے والے قصوں کی پرواہ کیے بغیر مسیح نے روبی کا ہاتھ تھام لیا۔مسیح کی خاموش مزاجی نے اسے کبھی مطمئن نہیں ہونے دیا تھا۔لیکن اپنے گھر والوں کی بے رخی دیکھ کر مسیح نے عہد وفا نبھانے کی ٹھان لی اور روبی کو اعتماد میں لینے کے بعد اس سے ایک قربانی مانگی۔

روبی کی والدہ اپنی بہن کے سرد رویے سے بہت پریشان تھیں۔مدتوں سے دیکھے ہوئے خواب کو وہ بھول جانا چاہتی تھیں۔کیونکہ آگے کا سفر انھیں ناممکن سا لگتا تھا۔

مسیح جب خاک زاروں کے سفر پر روانہ ہوا تو روبی کے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہ تھا سوائے تشنہ خوابوں اور مایوس لمحوں کی یاد کے۔وہ اس ساعت دشوار سے نبرد آزمائی کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے اسے کوئی نہ روک سکا۔ممبئی پہنچنے کے بعد کئی مہینے اسے سنبھلنے میں لگے۔

طویل سناٹے کے بعد ایک دن ڈاکیہ نے دروازے پر دستک دی۔ویران صحرا اور سنگلاخ زمینوں پر چلنے والے لہولہان قدموں میں یکا یک چھن چھن کرتے گھنگرو لگ گئے۔روبی نے اس طویل عرصے میں پورے گاؤں میں ہونے والی شادیوں کے کپڑے سل کر ایک ریکارڈ قائم کر لیا تھا۔مستقل مشین چلانے کی وجہ سے اس کے پیروں میں سوجن آگئی تھی۔مسیح کی رفاقت کا خواب اتنا خوبصورت تھا کہ یہ تکلیفیں اس پر اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔مسیح کا خط ایک طرف تو خوشی کی نوید لے کر آیا تھا لیکن دوسری طرف اسے غمگین بھی کر گیا تھا۔کیونکہ وہ اپنے والدین کو خوش کرنے اور روبی کو سارے عیش و آرام مہیا کرنے کی خواہش میں مالی طور پر بہت مضبوط بننا چاہتا تھا۔اس لیے وہ اپنے ایک دوست کی پیشکش کو رد نہ کر سکا جو دو سال عراق میں نوکری سے متعلق تھی۔

مسیح اپنی دادی کی زبانی بچپن سے ہی اپنے دادا کی محنت و جانفشانی کے قصے سنتا آیا تھا کہ انھوں نے کن مشقتوں سے کویت میں زندگی بسر کی۔مسیح کے دادا تھوڑے بہت پڑھے لکھے بھی تھے اسی لیے جب چار چھ برس بعد کویت سے گاؤں لوٹتے تو بڑی آؤ بھگت ہوتی اور پھر اس مشقت بھری زندگی کی ساری شکنیں وہیں اتار کر آتے تھے۔جب تک گاؤں میں رہتے ان کی کریزیں کھڑی رہتی تھیں۔

وہ شخص جسے پولیس کے نام سے خوف آتا ہو اور اسے فوجیوں کے کیمپ میں رہنے کے لیے کہہ دیا جائے تو کیا حشر ہوگا وہی بیان کر سکتا ہے۔مسیح کو

عراقی فوجیوں کے کیمپ میں کھانا کھلانے کی نوکری کی خبر ملی تو پیروں تلے زمین نکل گئی۔اس نے سوچا سانسوں کی قید سے آزاد ہو جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

کھانے کے وقت وہ گوش بر آواز رہتا لیکن اس کے ہاتھ اس قدر کانپتے کہ کبھی سالن تو کبھی دال گرا ڈالتا۔بھاری بوٹوں کی آواز سے اس کے کان پھٹنے لگتے تھے۔معمولی بات پر بھی چونک پڑتا۔کھانے پینے اور رہنے کا انتظام اول درجہ کا ہونے کے باوجود اس کی حالت صلیب پر لٹکائے جانے والے قیدی کی سی ہوگئی تھی۔فوجیوں کی تعداد دن بدن گھٹتی جاتی تھی۔وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتا تھا مگر اتنا بھی بے خبر نہیں تھا کہ کسی فرد کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو۔بظاہر سخت جان اور آہنی بازوؤں والے فوجی جب آپس میں باتیں کرتے تو ان کے چہروں پر عاجزی کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔

جنگ جاری تھی!!

سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں کے وطن چھوڑنے اور ہلاک ہونے کی خبریں سن کر روبی کا دل دہل اٹھتا تھا۔لیکن وہ سوچتی کہ جب اسی سرزمین پر طوفانِ نوح آیا تھا تو خدا نے اپنے عزیزوں کو راہِ نجات دکھائی تھی۔اب پھر اسی خطہ ارض پر مصیبت آن پڑی ہے تو خدا کیوں کر ساتھ نہیں دے گا۔وہ رحیم ہے،ضرور میرے مسیح کے لیے خضر کی صورت کسی کو بھیج دے گا۔دعائیں کرتے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی۔

وہ دادی سے بھی ہزار منتیں کرتی کہ مسیح کی واپسی کی دعا کریں۔دادی کے آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتیں ''روبی ہمار بچہ،ایسا نہ کہا کر۔بہوت تکلیف ہوت ہے۔'' روبی کی ساری لغزشیں بھول کر دادی اس کا خیال رکھنے لگی تھیں۔

لیکن ایسے نازک وقت میں بھی مسیح کے گھر لن ترانیاں جاری تھیں۔

''ارے ہم نے تو شروع میں ہی اعتراض کیا تھا۔اس ملک کی معیشت پر ہمیشہ سے لٹیروں کا قبضہ رہا ہے۔اور پھر خود وہاں کی عوام کیا کم خرافاتی ہے؟ فرقہ پرستی کی بنیاد پر آپس میں ہی کٹتی مرتی رہتی ہے۔اللہ میاں نے جس خزانے سے نوازا ہے اسی کا غلط استعمال کر رہی ہے۔اب یہی دیکھ لو!!! ایمان کی بات۔ہمارے مسیح کو ویزا کس کام کا دیا گیا اور کمبخت ماروں نے لے جا کر جھونک کہاں دیا''۔

دادی سب کی باتوں کی تردید کرتے ہوئے کہتیں ''مسیح کے دادا بتاتے تھے کہ عراق انسانی تہذیبوں کا آماجگاہ تھا۔ریاضی اور فلسفے کو یہیں سے پذیرائی ملی اور دنیا میں یہ تعلیمات عام ہوئیں۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارے مولا علی نے اسی ملک کے ایک شہر کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا''

لیکن یہ سچ ہے کہ جب اپنی زمینیں تنگ ہو جائیں تو اپنے وجود کا بوجھ ہجرت کے حوالے کرنا ہی پڑتا ہے۔کچھ بدنصیب تو ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے یہ دنیا ہی تنگ ہو جاتی ہے۔

تارکین وطن کو گرفتار کر کے جیل منتقل کیا جا رہا تھا جس کی وجہ سے ان کے ہمراہ آنے والے بچوں کو ان کے والدین سے الگ کر دیا گیا تھا۔اپنے والدین کو آہنی پنجروں میں قید دیکھ کر بچے بلک بلک کر روتے تھے۔

کسی طرح بچ بچا کر مسیح فوجیوں کے کیمپ سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور اللہ کا نام لے کر مہاجروں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔

وطن عزیز اور اپنوں کی یاد اسے ہر لمحہ بے چین رکھتی تھی۔اس نے سن رکھا تھا کہ عرب ممالک میں چھوٹے موٹے مجرموں کو چند روز گرفتاری کی سزا کاٹنے کے بعد ان کا ویزا کینسل کر کے وطن بھیج دیا جاتا ہے۔اسی لیے اس نے خون آلود عراق سے جان بچا کر سعودی عرب کا رخ کیا۔اپنے وطن کے بجائے اسی کو اپنی منزل سمجھ کر قدم آگے بڑھانے لگا۔اس نہتے، اکیلے شخص کے لیے جگنوؤں کی فوج اور سمندروں میں تیرتی مچھلیاں راہبر ٹھہریں۔

اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا جرم کتنا سنگین ہے اور اسی سنگینی کو مدنظر رکھ کر اس کے حق میں فیصلہ صادر کیا جائے گا۔اسی لیے تو جب وہ سعودی پہنچا تو خود کو پولیس کے حوالے کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔اپنے وجود کے علاوہ اس کے پاس اپنی کوئی شناخت نہ تھی۔جب وہ گرفتار ہوا تو ایک نہیں متعدد چارجیز اس پر لگائے گئے۔اس قید سے آزادی کے لیے ایک بھاری رقم کی ضرورت تھی۔جس کی تیاری میں روبی اور اس کی ماں دن رات لگی رہیں۔اپنی بساط بھر رقم اکٹھا کر کے انھوں نے ایک کرم فرما کے حوالے کر دیا۔

وسیع سمندر اور چمکتی ریت پر ایک کشتی نظر آتی ہے،روبی افق کی آخری کرن اوجھل ہونے تک اسے دیکھتی ہے۔موت سے پہلے آنے والی ہچکیاں اسے روز آتی ہیں مگر وہ زندہ ہے۔کیونکہ مسیح کی واپسی کی امیدیں ہنوز برقرار ہیں۔

□□□

Shahnaz Rahman
B/3 Alam Apartment,near Mamoon
Apartment
Tayyab Colony
Aligarh 202002 (U.P)

نظمیں

ڈاکٹر شبنم عشائی

رات کے کینوس پہ
نیند بنانا چاہتی ہوں
دن کی چوٹی کھولتی ہوں
ٹوٹے گیسوؤں کو گھٹن سے
آزاد کرتی ہوں
رنگ قید ہیں
رات کے سینے میں!
نیند اسیر ہے
مسخ شدہ محبتوں کے
چہروں میں!
رنگ اور نیند کے آزاد کرنے میں
بدن لہولہان ہے
اور من
بے لباس............

(1)

چھپ جاؤ
سب کے سب
چھپ جاؤ
اب کے
قدرت طیش میں ہے!

(2)

کس المیہ نے جنمی
یہ ہوا
جو زندگی کو
سانس نہیں لینے دیتی
صرف موت اگاتی ہے
موت کے جنگل
پوری کائنات میں
خودرو گھاس سے
پھیل رہے ہیں
انسان خود میں سمٹ رہا ہے
زندگی کا دم گھٹ رہا ہے
......حیات کے حیرت کدے میں
انسانوں کے بھید پڑے ہیں
کہتے ہیں
خوف خدا کا
قتل ہوا ہے......

Ms.Shabnam Ashai
Ashai Manzil
Tapar Patan
Kashmir-193121 (J & K)

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما

غزلیں

کیا ہوا سر جو تن سے جدا ہو گیا
حق محبت کا کچھ تو ادا ہو گیا

یہ مقدر بھی کیسی عجب چیز ہے
شاہ تھا جو کبھی، وہ گدا ہو گیا

سب کی آنکھوں کا تارا رہا عمر بھر
اس نے سچ جب کہا تو برا ہو گیا

زخم جانے ہی کتنے ہرے ہو گئے
آج ان سے مرا سامنا ہو گیا

جو وفاؤں کا پیکر تھا سب کے لیے
لوگ کہتے ہیں وہ بے وفا ہو گیا

تجھ سے شکوہ نہیں اے مرے ہم نشیں
ہاں مقدر ہی مجھ سے خفا ہو گیا

ایسا روٹھا وہ مجھ سے اے شاؔما کہ بس
روح کا جسم سے فاصلہ ہو گیا

خوں رنگ تمنا کا اثر ہے کہ نہیں ہے؟
ہستی یہ مری زیر و زبر ہے کہ نہیں ہے؟

لب پہ ہنسی کی دھوپ ہے نمناک ہیں آنکھیں
غم بھی خوشی سے شیر و شکر ہے کہ نہیں ہے؟

اس جیسا زمانے میں کوئی اور کہاں ہے؟
ممتاز ستاروں میں قمر ہے کہ نہیں ہے؟

تا عمر رہا سایہ فگن سب کے سروں پر
کیا جانیے وہ بوڑھا شجر ہے کہ نہیں ہے؟

اوروں کو پرکھنے کا ہنر آتا ہے ہم کو
آپ اپنے معائب پہ نظر ہے کہ نہیں ہے؟

نقش اس کے مٹانے میں ہمیں مٹ گئے شاؔما
اس بات کی اس کو ہی خبر ہے کہ نہیں ہے؟

Dr. Joohi Begum
59C/67C, South Malaka
Prayagraj 211003 (U.P)
Ph. 07985982665

لذیذ پکوان

ہری مرچ۔رائی کا اچار

اجزا: ہری مرچ اچار والی 250 گرام، رائی یا کالی سرسوں 4 چمچ، نمک 3 چھوٹے چمچ، زیرا ایک چھوٹا چمچ، سونف 1 چھوٹا چمچ، میتھی ایک چھوٹا چمچ، ہینگ چوتھائی چمچ سے کم، ہلدی پاؤڈر ایک چھوٹا چمچ، گرم مصالحہ آدھا چمچ، نیبو کا رس یا سرکہ 2 چمچ، تیل 4 چھوٹے چمچ

ترکیب: اس اچار کو ہم دو طریقے سے بنائیں گے۔

☆مرچ کو بھر کر

☆مرچ کو چھوٹا چھوٹا کاٹ کر

زیرا، میتھی، سونف اور سرسوں کو گرم توے پر ڈال کر ہلکا سا بھون لیجیے کہ مصالحوں کی نمی دور ہو جائے، مصالحے کو ٹھنڈا ہونے پر مکسی میں ہلکا دردرا پیس لیجیے، ہلدی، گرم مصالہ اور نمک بھی ملا لیجیے، مصالحے کو کسی پیالی میں نکال لیجیے۔

تیل کو کڑھائی میں ڈال کر گرم کر لیجیے، گیس بند کر دیجیے، تیل کو تھوڑا ٹھنڈا ہونے کے بعد ہینگ ڈال دیجیے، بھنے مصالحے میں نیبو کا رس اور تیل بھی ملا دیجیے۔ ایک ایک مرچ اٹھایئے اور مصالحہ لیجیے، مرچ کے اندر مصالحہ بھر کر کسی پیالے یا پلیٹ میں رکھتے جایئے، ساری مرچ اسی طرح بھر کر تیار کر لیجیے اب بچا ہوا تیل بھی مرچ کے اوپر ڈال دیجیے۔

بھری ہوئی مرچ کو آپ پتلے کپڑے سے ڈھک کر دھوپ میں بھی رکھ سکتے ہیں، اگر دھوپ نہ ہو تو کمرے کے اندر ہی پیالے کو رکھیے، اچار کو آپ ابھی بھی کھا سکتے ہیں لیکن اچار کا اصلی مزہ 4-3 دن میں تیار ہو کر ملے گا، سارے مصالحے مرچ کے اندر جذب ہو جائیں گے، اچار کو روزانہ دن میں 2-1 بار سوکھے اور صاف چمچے سے چلا کر اوپر نیچے کرتے رہیے۔ ہری مرچ کی رائی والا اچار تیار ہے، اچار کو کانچ یا چینی مٹی کے کنٹینرز میں بھر کر رکھ لیجیے اور آپ جب

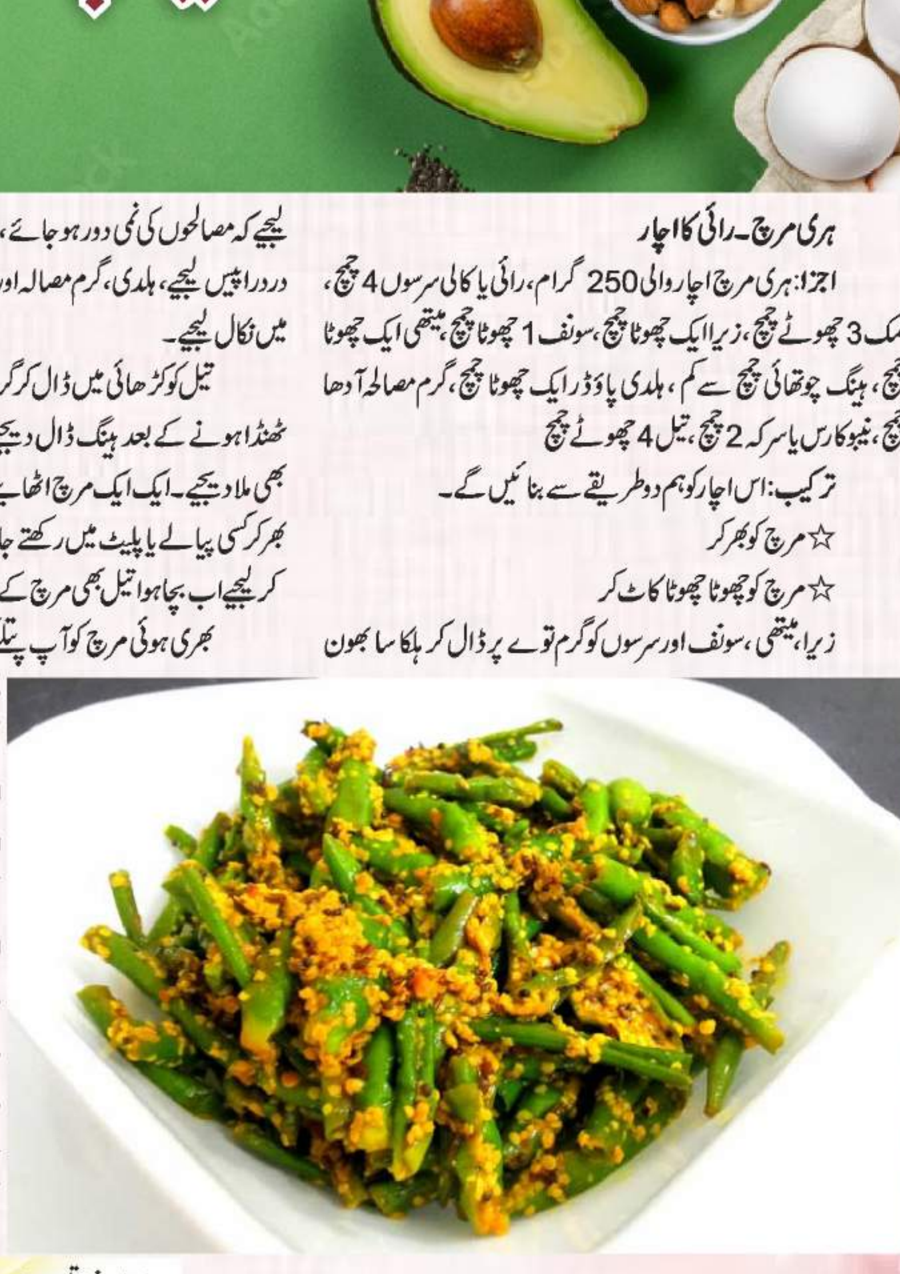

کھانا کھائے کنٹینر سے ہری مرچ کا اچار نکالیے اور کھائیے۔

ہری مرچ کو چھوٹا چھوٹا کاٹ کر اچار بنائیے

ہری مرچ کو اچھی طرح دھو لیجیے، سکھائیے، ڈنٹھل توڑیے اور صاف کپڑے سے پونچھ کر چھوٹا چھوٹا کاٹ لیجیے، کٹی ہوئی مرچ کسی پیالے میں رکھیے، نمک، ہلدی پاؤڈر اور نیبو کا رس ڈال کر چمچے سے اچھی طرح ملا دیجیے، پیالے کو ڈھک کر پورے دن بھر کے کے لیے چھوڑ دیجیے، مرچوں کو 6-5 گھنٹے بعد سوکھے چمچے سے چلا کر اوپر نیچے کر دیجیے۔

زیرا اور میتھی گرم توے پر ڈال کر ہلکا سا بھون لیجیے، ہینگ ڈالیے اور گیس بند کر دیجیے، رائی، زیرا، میتھی، ہینگ کو مکسی میں دردرا پیس لیجیے، ہلدی، گرم مصالحہ اور نمک بھی ملا لیجیے، مصالحے کو کسی پیالی میں نکال کر آدھا چھوٹا چمچ نمک اور آدھا چھوٹا چمچ ہلدی ڈال کر چمچے سے اچھی طرح ملا لیجیے۔

پیالے میں بھری مرچ کے اوپر یہ مصالحہ ڈالیے، تیل ڈالیے اور چمچے سے اچھی طرح چلا کر ملا دیجیے۔ پیالے سے بھری ہوئی مرچ کو آپ پتلے کپڑے سے ڈھک کر دھوپ میں بھی رکھ سکتے ہیں، اگر دھوپ نہ ہو تو کمرے کے اندر ہی پیالے کو رکھیے۔

ہری مرچ اور رائی والا اچار تیار ہے، اچار کو کانچ یا چینی مٹی کے کنٹینر میں بھر رکھ لیجیے۔

سویا چاپ لفافہ پراٹھا

اجزا: گیہوں کا آٹا ایک کپ (125 گرام)، میدہ ایک کپ ((125 گرام)، سویا چاپ 2، شملہ مرچ 1، ٹماٹر ایک باریک کٹا ہوا، ہرا دھنیا 3-2 بڑا چمچ، گھی 1 بڑا چمچ، پیزہ سوس ایک بڑا چمچ، ادرک آدھا انچ، ہری مرچ 2 باریک کٹی ہوئی، دھنیا پاؤڈر آدھا چمچ، لال مرچ پاؤڈر چھوٹا چمچ، اجوائن ایک چوتھائی چمچ، ہلدی پاؤڈر ایک چوتھائی چمچ، نمک ایک چھوٹا چمچ

ترکیب: سویا چاپ بنانے کے لیے سب سے پہلے آٹا تیار کر لیجیے۔ آٹا تیار کرنے کے لیے سب سے پہلے ایک برتن میں ایک کپ گیہوں کا آٹا، ایک کپ میدا، ایک چھوٹا چمچ گھی، ایک چوتھائی چمچ اجوائن اور آدھا چمچ نمک ڈال کر ملا لیجیے اور تھوڑا تھوڑا پانی ڈالتے ہوئے ہلکا سخت آٹا گوندھ لیجیے۔ آٹا تیار ہو جانے پر اسے 25-20 منٹ کے لیے سیٹ ہونے کے لیے ڈھک کر رکھ دیجیے۔

اسٹفنگ بنانے کے لیے 2 سویا چاپ لے کر پتلا پتلا کاٹ لیجیے۔ اب ایک پین میں ایک چھوٹا چمچ گھی ڈال کر گرم کر لیجیے۔ گھی کے میلٹ ہو جانے پر اس میں سویا چاپ ڈال کر ہلکا کلر براؤن ہونے تک میڈیم آنچ پر چلاتے ہوئے بھون لیجیے۔ چاپ کے بھن جانے پر پین میں ایک شملہ مرچ ڈال کر دو منٹ تک بھون لیجیے۔ شملہ مرچ کے بھن جانے کے بعد ایک باریک کٹا ٹماٹر، ایک چوتھائی ہلدی پاؤڈر، آدھا چمچ دھنیا پاؤڈر، 2 ہری مرچ، آدھا انچ ادرک، آدھا چمچ لال مرچ پاؤڈر، ایک بڑا چمچ پیزا سوس اور آدھا چمچ نمک ڈال کر سبھی چیزوں کو ملاتے ہوئے 2-1 منٹ تک بھون لیجیے۔ سبزیوں کے مل جانے پر اس میں 2 بڑے چمچ پانی ڈال کر ڈھک کر 3-2 منٹ تک دھیمی آنچ پر پکا لیجیے۔

2 منٹ بعد سبزی میں ہرا دھنیا ڈال کر پکا لیجیے اور کسی برتن میں نکال کر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیجیے۔

20 منٹ بعد آٹے کو نکال کر مسل مسل کر سوفٹ کر لیجیے۔ اب آٹے میں سے تھوڑا سا ٹکڑا لے کر لوئی بنا کر سوکھے آٹے میں لپیٹ لیجیے۔ اب آٹے کو 12-10 انچ میں بیل کر بڑی سی روٹی بنا لیجیے۔

اب روٹی پر گھی لگا کر بیچ میں اسٹفنگ رکھ کر چوکور شیپ دے دیجیے۔ اب ایک کٹوری میں ایک چمچ سوکھا آٹا لے کر ہلکا سا پانی ڈال کر گاڑھا گھول بنا لیجیے۔ اب روٹی وایک سائڈ موڑ کر آٹے کا گھول بنا کر دوسری سائڈ کے حصے کو چپکا دیجیے۔ اسی طرح روٹی کے اوپر اور نیچے کے سرے پر بھی آٹے کا گھول لگا کر چپکا دیجیے۔ اب ایک توے پر ہلکا سا گھی ڈال کر گرم کر لیجیے۔ گھی کے میلٹ ہو جانے پر اس پر لفافہ رکھ کر 3-2 منٹ دھیمی آنچ پر سکنے دیجیے۔ ایک سائڈ سک جانے پر لفافے کے اوپر گھی لگا کر اسے دوسری سائڈ بھی سک لیجیے۔ سویا چاپ لافہ بن کر تیار ہے اسی طرح سے آپ باقی لفافہ تیار کر سکتے ہیں۔

(بحوالہ www.nishamadhulika.com)

مشکور احمد

صحت (Health)

عالمی ادارۂ صحت کے تحت "صحت جسم کی وہ مکمل حالت ہے جس میں انسان طبعی، ذہنی، سماجی اور روحانی طور پر مکمل طور سے حالت صحت میں ہو صرف بیماری یا بدوضعی کا نہ ہونا صحت نہیں ہے" موجودہ دور میں ایک پہلو یہ بھی شامل کر لیا گیا ہے کہ انسان معاشی طور پر خوشحال زندگی گزار رہا ہو۔

یہ تعریف کافی وسیع نظریہ رکھتی ہے اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صحت کو جسم کی حالت نہ مان کر ایک مستقل ردعمل سمجھا جائے جو ہمہ وقت زندگی کے مسائل اور ضروریات کے تحت بدلتا ہے اور اس کے مطابق جسم کو ڈھالتا رہتا ہے اس کے ذریعہ لوگوں کو رہن سہن میں سہولت ہوتی ہے اور وہ زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کی مذکورہ تعریف کو اکثر لوگ خیالی تعریف تصور کرتے ہیں، نہ کے حقیقی، کیونکہ یہ وہ صورت حال ہے جو شاذ ہی کسی شخص میں موجود ہو سکتی ہے۔ لیکن عمومی طور پر اس کا ملنا مشکل ہے۔ بعض لوگ اس تعریف کو ہماری روزمرہ کی ضروریات کے مطابق صحیح نہیں مانتے اور اس طرح کوئی بھی شخص اس تعریف کی روشنی میں مکمل صحت کا حامل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس طرح یہ طے کر سکتے ہیں کہ اگر مذکورہ تعریف ہی صحیح صحت کی تعریف ہے تو کوئی بھی انسان صحت مند نہیں ہے۔

صحت کی خصوصیات (Properties of Health)

صحت ایک سہ خصوصیاتی نظریہ ہے، عالمی ادارۂ صحت کے مطابق جملہ تینوں خصوصیات زیادہ اہم ہیں۔ طبعی، دماغی اور سماجی اس کے ساتھ ہی روحانی اور نفسیاتی پہلو بھی قابل ذکر ہیں۔

طبعی خصوصیت (Physical Dimention)

یہ خصوصیت سمجھنے میں سب سے زیادہ آسان ہے۔ اس کے مطابق صحت کا مطلب ہے جسم کے افعال کا بہتر شکل سے انجام دیا جانا۔ اس کے مطابق جسم کے تمام تر خلیات و اعضا اپنی بہتر حالت میں ہوتے ہیں، حالانکہ اس جگہ بہتر کو واضح کرنا قدرے مشکل ہے۔

طبعی طور پر صحت کی حالت میں انسان کی رنگت عمدہ ہوگی، آنکھیں چمکدار، بال چمکدار اور عضلات مضبوط ہوں گے۔ ساتھ ہی وہ خوش لباس ہوگا۔ سانس میں بدبو نہیں ہوگی۔ بھوک اور نیند بہتر ہوگی، بول و براز کا عمل متوازن ہوگا۔

عالمی ادارۂ صحت کے مطابق صحت کی تعریف

صحت اس حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان جسمانی، دماغی،

سماجی اور روحانی اعتبار سے مکمل طور پر اچھی حیثیت کا حامل ہو اس میں کسی طرح کی کوئی بیماری نہ ہو اور نہ ہی کوئی نقص ہو۔

"Health is a state of complele Physical, mental, social and spritual wellbeing not merely an absence of disease or infirmity".

اکثر ماہرین کا خیال ہے کہ صحت کی مندرجہ بالا سہ رخی کیفیت میں بہت سے ایسے پہلو بھی ہیں جن کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، جیسے روحانی صحت، جذباتی صحت، Vocational Health اور بہت سے دیگر پہلو جو صحت کے لیے ضروری ہیں۔

صحت کے مختلف پہلو (Various Dimentions of Health)

عالمی ادارۂ صحت کی جاری کردہ صحت کی تعریف کے مطابق صحت کے تین اہم پہلو ہیں۔ جسمانی، دماغی، اور نفسانی، اس کے علاوہ چند اور پہلو بھی ہیں جو صحت میں شمار کیے جاسکتے ہیں مثلاً روحانی، جذباتی اور سیاسی وغیرہ۔

(1) جسمانی صحت (Physical Health)

جسمانی صحت کا تعلق منافع الاعضائی افعال سے ہے یعنی وہ حالت جس میں بدن کے تمام اعضا نسیج وخلیات مکمل طور پر بہترین حالت میں ہوں اور اپنے افعال ٹھیک طور پر انجام دے رہے ہوں۔ اس کو بہترین جسمانی صحت کہا جاتا ہے۔

جسمانی صحت کے بہترین ہونے کی علامات

صاف رنگت، صحت مند جلد، روشن آنکھیں چمکدار بال، جسم پر مناسب مقدار میں لحم کی موجودگی، لیکن موٹاپا نہ ہو، طبعی بھوک، مناسب مقدار میں نیند کا آنا، بول و براز کی باقاعدگی، حرکات جسمانی کی طبعی اور بآسانی ادائیگی، اندرونی طور پر تمام اعضائے جسمانی کا طبعی جسامت کا ہونا، حواس خمسہ کا طبعی ہونا، نبض، ضغط الدم اور حرکات کا عمر وجنس کے اعتبار سے طبعی ہونا، نوعمری میں مناسب طور پر وزن کا بڑھنا اور پچیس سال کی عمر کے بعد اس وزن مین دو تین کلو سے زیادہ کا تغیر واقع نہ ہونا۔ طبعی صحت کی شرائط بہت سے صحت مند اشخاص کے مشاہدوں کی بنا پر تیار کی گئی ہیں اور معلومات میں اضافہ کے ساتھ ان میں کمی وبیشی کی جاسکتی ہے۔

اگر کسی ملک یا سماج میں بڑے پیمانے پر جسمانی صحت کا اندازہ لگانا ہو تو نومولود کی شرح اموات Infant Mortality Rate اور Life Expectancy کے ذریعہ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(2) دماغی پہلو (Mental Dimension)

دماغی صحت کے معنی محض امراض دماغیہ کی غیر موجودگی نہیں ہے۔ اچھی دماغی صحت کے معنی ہیں کہ انسان زندگی کے مختلف مراحل میں کس طرح Respond کرتا ہے اور ان مراحل سے کس طرح مثبت انداز میں تجربات حاصل کرتا ہے۔ چند دہائی قبل دماغ و بدن کے امراض کو ایک دوسرے سے الگ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں محققین نے ثابت کیا ہے کہ بہت سے نفسانی عوارضات مختلف جسمانی بیماریوں کا باعث ہو سکتے ہیں مثلاً ضغط الدم قوی، دمہ، التہاب معدہ، قرحۂ معدہ وغیرہ اسی طرح بہت سے نفسانی امراض کا باعث جسمانی عوارضات ہو سکتے ہیں

مثلاً Schizophrenia۔

دماغی صحت کا اندازہ مندرجہ ذیل باتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

i۔ انسان خود کو محفوظ اور درست سمجھتا ہو۔
ii۔ اپنی قابلیت کے بارے میں زیادہ خوش فہمی یا کم فہمی کا شکار نہ ہو۔
iii۔ اپنی غلطیوں کو قبول کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا ہو۔
iv۔ خود پرست ہو۔
v۔ اپنی شناخت کے لیے کوشاں ہو۔
vi۔ زندگی کی مقصدیت، ضروریات، پریشانیوں اور مقاصد کو سمجھتا ہو۔
vii۔ جذباتیت اور Rationality میں مناسبت رکھتا ہو۔
viii۔ مشکل حالات میں عقلمندی کے ساتھ ان کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔

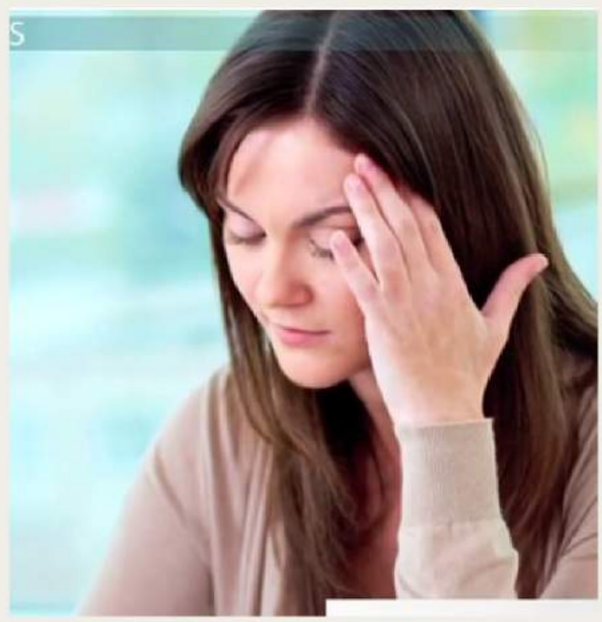

(3) سماجی پہلو (Social Dimension)

سماجی طور پر صحت مند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے، اپنے متعلق افراد سے اور تمام دنیا کے لوگوں سے روابط رکھتا ہو اور ماحول کو بہتر سمجھتا ہو۔ صحت کے سماجی پہلو کا اطلاق ہر انسان کی زندگی پر ہوتا ہے اور یہ مانا جاتا ہے کہ ہر فرد سماج کا ایک حصہ ہے اور اس کی سماجی اور معاشی حیثیت کا اثر اس کی جسمانی و دماغی صحت پر بھی ہوتا ہے۔

(4) روحانی پہلو (Spiritual Imension)

روحانی صحت میں انسان کے اصول، زندگی کی مقصدیت، احساسات اور نیکی و بدی کا ادراک ہونا شامل ہے۔ روحانی صحت چونکہ ایک نیا تصور Concept ہے اس لیے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل موجود نہیں ہے۔ روحانی ماہرین کے اعتبار سے روحانی صحت کے معنی ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں ایک مخصوص ڈگر پر چلنے کے بجائے اس میں مقصد و معنی تلاش کرنے کی اور ان کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ چونکہ روحانی صحت کا تعلق ادراک سے ہے اس لیے اس کو مفصل بیان کرنا مشکل ہے۔

(5) جذباتی پہلو (Emotional Dimension)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ جذباتی صحت کا تعلق انسان کے احساسات اور جذبات سے ہے۔ جذباتی و دماغی صحت میں بہت ہی معمولی سا فرق ہے۔ دماغی صحت کا تعلق علم یا جاننے سے ہے، جب کہ جذباتی صحت کا تعلق احساسات سے ہے، حالانکہ کچھ عرصہ پہلے ان دونوں کو ایک ہی ضمن میں تصور کیا جاتا تھا۔

(6) پیشہ ورانہ پہلو (Vocational Dimension)

اس پہلو کا تعلق انسان کے کام سے ہے، جو کہ زیادہ تر ذریعہ معاش ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اگر انسان کا کام اس کے مقاصد، کام کرنے کی صلاحیت اور اس کی کمزوریوں کو مدنظر رکھ کر طے کیا جائے تو یہ کام اس کی جسمانی و دماغی صحت کی نشوونما میں مدد کرتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے انسان بہتر طور پر اپنے افعال انجام دیتا ہے۔ جس سے اسے طمانیت کا احساس ہوتا ہے، چنانچہ یہی زندگی میں کامیابی کا باعث بنتا ہے۔

متفرق پہلو (Others)

اس کے علاوہ صحت کے چند اور پہلو بھی زیر بحث ہیں مثلاً

(i) فلسفیانہ پہلو (Philosophical Dimension)
(ii) تہذیبی پہلو (Cultural Dimension)
(iii) سماجی و معاشی پہلو (Socio-economical Dimension)
(iv) ماحولیاتی پہلو (Environmental Dimension)
(v) علمی پہلو (Educational Dimensio)
(vi) غذائی پہلو (Nutritional Dimension)
(vii) معالجاتی پہلو (Curative Dimension)
(viii) تحفظی پہلو (Preventive Dimension)

(ماخوذ حفظان صحت، سنہ اشاعت 2018، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

□□□

حسن کی نگہداشت

ہیئر کنڈیشنر بنانے کا طریقہ

شیمپو کے بعد کنڈیشنر استعمال کرتے ہیں تو کیمیکل سے پاک کنڈیشنرز کا استعمال کریں تاکہ بالوں کو وقتی فائدے سے بچا کر مکمل مستقل فائدہ پہنچایا جاسکے اور بالوں کو قدرتی طور پر مضبوط بنایا جاسکے۔

گھر میں ہی آپ بالکل کیمیکل سے پاک کنڈیشنر تیار کرسکتی ہیں۔

ٹپ:

☆ایک کپ سادہ قہوہ بنا کر اس کو ہلکا ٹھنڈا کرلیں۔

☆پھر اس میں ایک انڈہ ملائیں اور اچھی طرح پھینٹ لیں۔

☆اس کے بعد تین چمچ پتوں والی سوکھی مہندی ڈالیں اور چار چمچ دہی ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔

☆دو چمچ سرسوں کا تیل یا کوئی بھی تیل اس کے علاوہ دو وٹامن ای کے کیپسول شامل کرلیں۔

☆ان تمام چیزوں کو ایک ایک کرکے شامل کریں تاکہ اچھی طرح ہر چیز کو مکس کیا جاسکے۔

☆یہاں آپ کا گھریلو کنڈیشنر تیار ہوگیا ہے، لہٰذا اب آپ اس کو اپنے بالوں میں اچھی طرح جڑوں تک پھیلا کر لگائیں اور کچھ دیر چھوڑ دیں اس کے بعد پانی سے دھولیں۔

یہ کنڈیشنر نہ صرف روکھے بالوں میں جان ڈالے گا بلکہ بالوں کی نشوونما بھی کرے گا، نئے سرے سے سر پر بال اگانے کا بہترین کنڈیشنر ہے یہ۔ اس کا ہفتے میں دو مرتبہ استعمال آپ کو بہتر نتائج دے سکتا ہے۔

کہنیوں کے بدنما داغ دھبے دور کرنے کے چند مفید طریقے

بعض خواتین میک اپ کرتے وقت کہنیوں کو نظر انداز کردیتی ہیں۔ کہنیوں میں سیاہ اور خشک دھبے یا میل ہاتھوں اور بازوؤں کا حسن غارت کردیتے ہیں۔ اس کے لیے آپ لیموں کے عرق کا استعمال باقاعدگی سے کریں۔ لیموں کا عرق کہنیوں پر لگانے سے سفید اور نرم ہوجاتی ہیں۔

کہنی کی سخت جلد کو ملائم کرنے کے لیے بادام کا پاؤڈر بنا کر اس میں تھوڑا لیموں کا عرق ملا دیں، اس کے بعد کہنی کا مساج کریں، کچھ دیر بعد اس کو نیم گرم پانی سے دھولیں۔ اس کے علاوہ کہنی پر میک اپ کرنے کے لیے سب سے پہلے کوئی کولڈ کریم کہنی پر اچھی طرح لگالیں۔ پھر اس پر ٹیلکم پاؤڈر لگائیں۔ اب اسے ٹشو یا فلالین کے کپڑے سے رگڑ دیں۔ چند دن کی توجہ سے کہنی کی رنگت نکھر جائے گی۔

کہنیوں کے بدنما داغ دھبے دور کرنے کے چند مفید طریقے

آپ کی کہنیوں کے بدنما داغ دھبے دور کرنے کے چند مفید طریقے درج ذیل ہیں۔

2۔ کہنی کے سادہ دھبے دور کرنے کے لیے لیموں کاٹ کر اس کا رس نکال کر علیحدہ کرلیں اور چھلکوں میں آدھا چائے کا چمچ دودھ ڈال کر کہنی پر خوب رگڑیں۔ چند دنوں کے استعمال سے ہی آپ کی کہنیاں صاف اور نرم وملائم ہوجائیں گی۔

2۔ ایک چھوٹا چائے کا چمچ وٹامن ای میں ایک چھوٹا چائے کا چمچ لیموں کا رس، گلیسرین، چار بڑے کھانے کے چمچ دودھ شامل کرلیں اور اس کا پیسٹ بنالیں۔ پھر اس پیسٹ کو کہنیوں پر پندرہ منٹ لگا رہنے دیں اور اس کے بعد کہنیوں کو تازہ پانی سے دھوکر خشک کرلیں۔ آپ کی کہنیوں کے داغ دھبے اس پیسٹ کے چند دنوں کے استعمال سے ہی غائب ہوجائیں گے۔

3۔ ایک چائے کا چمچ ناریل کے تیل میں آدھ چائے کا چمچ لیموں کا رس ملا کر لگانے سے بھی کہنیاں بے داغ اور خوبصورت ہوجاتی ہیں۔

4۔ کہنیوں پر سرسوں کے تیل کا مساج بھی ان کی خوبصورتی اور رعنائی میں اضافہ کرتا ہے اور ان پر پیدا ہونے والی خشکی کو کنٹرول کرکے کہنیوں کو بدنما ہونے سے بچاتا ہے۔

5۔ گلیسرین میں عرق گلاب کی مناسب مقدار شامل کرکے لگانے سے آپ کی کہنیوں سے بدنما سیاہ دھبے دور ہوجاتے ہیں۔

6۔ سن اسکرین کا باقاعدہ استعمال بھی نہ صرف آپ کی کہنیوں کو نرم وملائم احساس بخشتا ہے بلکہ انھیں کھردرا اور خشک ہونے سے بھی بچاتا ہے۔

شہد سے بلیچ کرنے کا طریقہ

لڑکیاں ہر ہفتے چہرے پر بلیچ کرتی ہیں تاکہ نہ تو اضافی بال نظر آئیں اور نہ ہی ان کے چہرے کی رنگت کم نظر آئے، بنیادی طور پر کم وقت اور کم محنت میں زیادہ اچھا رزلٹ مل جائے لیکن بازاری بلیچ میں اس قدر کیمیکل موجود ہوتا ہے جو کہ آپ کی جلد کو اندورنی طور پر بالکل بے رونق کر دیتا ہے بس وقتی طور پر چہرے کی رنگت کو جگمگا دیتا ہے۔

لیکن اگر قدرتی اجزاء سے بلیچ کیا جائے تو رزلٹ بھی مناسب مل جاتا ہے اور کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا۔

ٹپ:

☆ ایک چمچ شہد اور ایک چمچ میٹھا سوڈاا اچھی طرح چمچ کی مدد سے مکس کریں۔

☆ اس کے بعد ایک لیموں کا رس اور دو چمچ گلاب کا عرق مکس کرلیں۔

☆ آپ کا بلیچ تیار ہوگیا ہے۔

☆ اس کو چہرے پر 20 منٹ کے لیے لگائیں اور پانی سے منہ دھولیں۔

☆ روزانہ بھی اس بلیچ کو چہرے پر لگا سکتی ہیں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

فائدہ

☆ شہد میں شامل سیروٹونین اور اینٹی آکسیڈنٹس بلیچنگ ایجنٹ کا کام کرتے ہیں جبکہ لیموں اور میٹھا سوڈا میگنیشیئم اور سوڈیئم کے خواص رکھتے ہیں جو سیروٹونین کے ساتھ مل کر جلد کی رونق کو بحال کرنے کا کام کرتے ہیں اور ڈیڈ سیلز کو ختم کرنے کا کام کرتے ہیں۔

(بحوالہ www.kfoods.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

مئی 2021 کا تازہ شمارہ انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ مئی کے شمارے کے مشمولات پر نظر پڑی۔ اس شمارے میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر نوشین حسن صاحبہ کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہاجرہ نازلی واقعی ایک اہم ناول نگار ہیں۔ مضمون نگار نے ان کے ناولوں کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔ دوسرا مضمون آزادی سے قبل خواتین کی ناول نگاری کا اجمالی جائزہ ہے۔ ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ نے اس مضمون کو لکھا ہے۔ اعجاز شاہین کے افسانوں میں عورت کے مسائل کی عکاسی بھی عمدہ مضمون ہے۔ خواتین کے ذریعہ اعجاز شاہین نے خواتین کے مسائل کی نمائندگی اپنے انداز سے کی ہے۔ ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی یہ مضمون شہری اور دیہی علاقوں میں رہنے والی خواتین کی حالت زار کو پیش کرتا ہے۔ توصیف بریلوی نے اردو ادب میں ماحولیاتی تانیثیت کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ خواتین کے مسائل اور اخبارات مضمون بھی خواتین کے حوالے سے اہم اور اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کا علمبردار: ڈپٹی نذیر احمد یہ مضمون بھی عمدہ مضمون ہے۔ جدید غزل اور عشق کا بدلتا تصور بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعرات کے منتخب اشعار بھی پسند آئے۔ مثلاً یہ اشعار:

جلنے لگے چراغ ترے غم کے شام سے
شام فراق آئی بڑے اہتمام سے

زباں کھلی نہ نگاہیں ملیں نہ بات ہوئی
عجیب رنگ میں شرح غم حیات ہوئی

کہانیوں میں ڈاکٹر عشرت ناہید اور نیلوفر پروین کی کہانی پسند آئی۔ حسن سخن میں فرحانہ نازنین کی غزل اچھی لگی۔ اداریہ میں مدیر اعلیٰ نے خواتین کی کارکردگی کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ غرض ہر اعتبار سے یہ شمارہ ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔

اس شمارے کے تمام مضامین اعلیٰ اور معیاری ہیں جن کو پڑھ کر ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ 'خواتین دنیا' کے کالم حسن کی نگہداشت بھی بہت پر کشش اور جاذب نظر ہے۔ خواتین اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو خصوصی طور پر خواتین کے لیے ہی ہے۔ صحت کے متعلق جو کالم ہے اس میں بھی کم وبیش خواتین کی صحت کے تئیں خواتین کو بیدار کیا جاتا ہے تاکہ ان کا اپنی صحت کے تئیں جو رویہ ہے وہ تبدیل ہو سکے۔ خبروں کے کالم کے تحت بھی خواتین کی سرگرمیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

اداریے سے لے کر تاثرات تک سبھی کچھ قابل غور اور قابل ستائش ہوتا ہے چاہے مضامین ہوں یا دیگر کالمز۔ یہ رسالہ ہر زاویہ سے قابل مطالعہ اور قابل تحسین ہے۔ اس رسالے کے مضامین اپنے اندر علمی بصیرت رکھتے ہیں جن کو پڑھ کر ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ارم پروین، اورنگ آباد، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات جوش (جلد دوم، سوم)

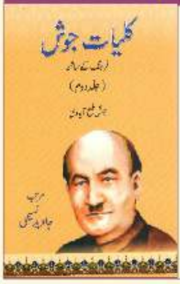

مرتب: جاوید نسیمی

صفحات: 974 (دوسری جلد)

514 (تیسری جلد)

قیمت: 425 روپے (دوسری جلد)

240 روپے (تیسری جلد)

دکن میں اردو

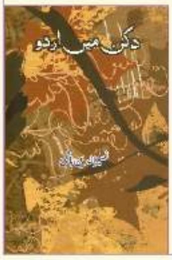

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

پانچویں طباعت: 2020

صفحات: 945

قیمت: 340 روپے

اردو کی صوتی لغت

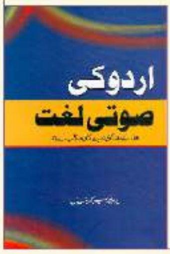

مصنف: نصیر احمد خاں

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 1232

قیمت: 665 روپے

ہندوستانی نظام قانون

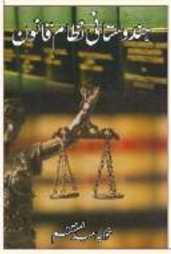

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 381

قیمت: 190 روپے

کشمیر کی وادی

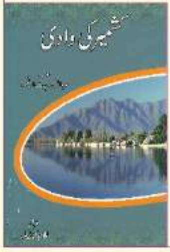

مصنف: سر والٹر روپرٹ لارنس

مترجم: غلام نبی خیال

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 587، قیمت: 217 روپے

زراعت اور پیشہ ورانہ تعلیم

مصنف: سہراب علی، مترجم: ابوعبداللہ منصور

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 338

قیمت: 165 روپے

تعلیمی نفسیات

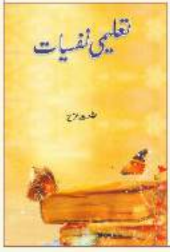

مصنف: طلعت عزیز

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 242

قیمت 130 روپے

منٹو کے نادر خطوط

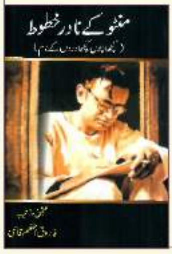

تحقیق و ترتیب: فاروق اعظم قاسمی

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 62

قیمت: 55 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जून-२०२१ वर्ष: ५, अंक: ०६
Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2021, Vol. 5, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-06-2021
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6